کاروانِ صحافت

از

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی

کاروانِ صحافت

(اردو صحافت پر مقالات کا مجموعہ)

ڈاکٹر عبد السّلام خورشید

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ ——— کراچی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو نمبر ۳۱۹

اشاعتِ اول ۱۹۶۴ء
تعداد ایک ہزار
طابع انجمن پریس کراچی

قیمت
چار روپے

فہرستِ مضامین

انتساب

پروفیسر حمید احمد خاں

کے

نام

استاذی مکرم

آداب۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب مجھے اسلامیہ کالج لاہور میں آپ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ۱۲ اگست ۳۷ء کو آپ نے موسم گرما کی چھٹیوں کے دوران میں کرم آباد سے میرے نام ایک مکتوب میں لکھا:۔

"مجھے اخبارات سے یہ معلوم کر کے بہت
خوشی ہوتی رہتی ہے کہ تم ابھی زندہ ہو۔
اس سے امید بندھتی ہے کہ اردو صحیفہ نگاری
پر تمہارا مضمون ضرور مکمل ہو جائے گا۔ کیونکہ
تم نے اس کی تکمیل کے لئے صرف اپنی زندگی کی

سہل شرط لگا رکھی ہے۔"

اسی مکتوب کے جواب میں آج ربع صدی کے بعد یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اگر اس میں کوئی اچھی بات مل جائے تو سمجھئے یہ استاد کے فیضانِ نظر کا کرشمہ ہے۔ اور جب تک زندہ ہوں فیض کا متمنی ہوں۔

آپ کا مخلص

عبدالسلام خورشید

۱۰۔ سالک روڈ، مسلم ٹاؤن

برلبِ نہر — لاہور

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی
انجمن ترقی اردو۔

حرفے چند

کاروان صحافت اردو صحافت کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کرلے گی۔ حیرت ہے کہ اردو صحافت اتنی قدیم ہو چکی ہے لیکن محققین نے اسکی تاریخ لکھنے پر بہت کم توجہ دی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ حوالوں کے لئے مواد اور ماخذ تلاش کرنا سخت محنت کا کام ہے اور

کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے صحافت کی گود میں پرورش پائی خود صحافی ہیں اور صحافت ہی کا مضمون پڑھاتے ہیں۔ انکے نقطہ نظر سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن انکے خلوص تجسس انکی محنت اور انداز بیان کی داد سب دیتے ہیں۔ صحافت پر ہی انکی کتاب ,, اردو صحافت ہند و پاکستان میں ،، کو داؤد ادبی انعام مل چکا ہے۔

اس کتاب میں آنیس مقالے ہیں جن کے موضوعات رنگا رنگ ہیں۔ وہ اردو صحافت کے بارے میں ہی بہت سی تاریخی اور دلچسپ اطلاعات بہم نہیں پہنچاتے بلکہ ان میں برصغیر کی بہت سی سیاسی اور سماجی تحریکوں کے واضح عکس بھی ملتے ہیں۔ یہ اس کتاب کی ایک اہم اضافی خصوصیت ہے۔

ملکی صحافت میں پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ نئے صحافیوں کے لئے اپنی تاریخ جاننا بھی نہایت ضروری ہوتا جاتا ہے۔ اس مسئلے کے کئی پہلو ہیں۔ علمی ' پیشہ ورانہ اور تاریخی۔ ہمارا خیال ہے کہ ان مقالوں میں ان سب پر کافی مواد ملے گا۔

پیش لفظ

تاریخِ صحافت میرا محبوب موضوع ہے۔ اور اس کے مختلف پہلوؤں پر علمی تحقیق مجھے جنون کی حد تک پسند ہے۔ پہلے شاہی وقائع نگاری پر ایک طویل مقالہ لکھا۔ جو ہالینڈ کے ایک ناشر نے کتابی صورت میں چھاپا۔ اور جس پر مجھے اسٹرڈم یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ عطا کی۔ پھر "تاریخِ صحافتِ پاکستان۔ ابتدائی دور، ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۷ء تک" کے عنوان سے ایک اور مقالہ بزبانِ انگریزی لکھا۔ جس پر سٹراس بورگ یونیورسٹی (فرانس)، نے سندِ اعلیٰ عطا کی۔ اس کے بعد "تاریخِ صحافتِ ہند" پر ایک کتاب لکھی، جس میں پہلی مرتبہ برِّ عظیم کی اردو صحافت کی ایک مکمل تاریخ قلمبند ہوئی۔ اور اب اہلِ نظر کے سامنے اپنے وہ مقالے پیش کرتا ہوں جو صحافت کے مختلف پہلوؤں پر گذشتہ آٹھ دس سال میں لکھے۔ ان میں صرف دو مقالے ایسے ہیں جو ثانوی ذرائع پر مبنی ہیں۔ ایک "انیسویں صدی میں آدابِ صحافت" اور دوسرا "انیسویں صدی کی اردو صحافت اور عوام کی ترجمانی" باقی سب مقالے ایسے اصل ذرائع پر مبنی ہیں جن کی چھان بین میں نے خود کی ہے

جن اخباری فائلوں کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں کچھ میرے نجی کتب خانہ میں ہیں۔ کچھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اور "ستارۂ صبح" کا فائل مولانا غلام رسول مہر سے لیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اہلِ علم اور اہلِ نظر ان مقالوں کو پسند فرمائیں گے۔ اور اگر کوئی غلطی دیکھیں تو مجھے اس سے مطلع کریں گے۔

جناب جمیل الدین عالی کا ممنون ہوں کہ ان کی نوازش اور برادرانہ تعاون کے بغیر شاید یہ مجموعہ منظرِ عام پر نہ آتا۔

عبدالسلام خورشید

محمد حسین آزاد اور صحافت

برعظیم پاک وہند میں اردو صحافت کا آغاز "جام جہاں نما" سے ہوا۔ لیکن اردو کا پہلا دبستانِ صحافت "دہلی اردو اخبار" تھا جسے مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر نے ۱۸۳۷ء میں جاری کیا۔ اس وقت آزاد کی عمر دس برس کے قریب تھی۔ انھوں نے بچپن سے علمی اور ادبی اور صحافتی ماحول میں پرورش پائی۔ نثر نویسی اور صحافت میں اپنے والد بزرگوار سے رہنمائی لی۔ اور شعر و شاعری میں استاد ذوق سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ اور جب تعلیم سے فارغ ہو کر علم و ادب اور صحافت میں کافی دسترس حاصل کر لی تو ۱۸۵۴ء میں غالباً اکتوبر کے مہینے میں "دہلی اردو اخبار" کی ادارت سنبھال لی۔ اگرچہ "دہلی اردو اخبار" شروع ہی سے ایک بلند معیار پرچہ تھا۔ دربارِ معلیٰ کی ہلکی پھلکی سیاست، صاحبِ کلاں کی نقل و حرکت دلی کی معاشرتی زندگی، اور دیسی ریاستوں کی سیاست کے اتار چڑھاؤ کا عکاس اور تمام علمی و ادبی مباحث کا مخزن تھا۔ اور اِسے غالب، ذوق

مومن۔ بہادر شاہ ظفرؔ اور نواب زینت محل بیگم کے کلام کی باقاعدہ اشاعت کا فخر حاصل تھا۔ لیکن آزادؔ کی آمد سے یہ اخبار فنی لحاظ سے پہلے سے کہیں بہتر ہو گیا۔ زبان نکھر آئی۔ تحریر کے اسلوب میں سلاست اور بے ساختگی کے عناصر نے اخبار کو قارئین کے لئے اور زیادہ پُرکشش بنا دیا۔ خبروں کی ترتیب کا انداز تو وہی رہا لیکن تلخیص نے ان میں نئی جان ڈال دی اور نتیجے کے طور پر خبروں کی تعداد بھی پہلے سے بڑھ گئی۔

جب ۱۸۵۷ء کا انقلاب آیا اور اپنے جلو میں دِلّی کے لئے آزادی کا ایک مختصر سا دَور لایا۔ تو "دہلی اردو اخبار" پر ایک نیا جوبن آیا۔ خبروں کی پیشکش میں ایک بیانیہ اور ڈرامائی انداز پیدا ہوا۔ جسے آج کی صحافتی زبان میں "فیچر" کہتے ہیں۔ ان خبروں کو پڑھئے تو یوں محسوس ہوگا جیسے ہم عروس البلاد دہلی کے کسی گوشے میں بیٹھے آگ اور خون کے اُس ہولناک کھیل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جس نے چند مہینوں کے لئے دلّی کی اجتماعی زندگی میں ایک انشراح تو ضرور پیدا کیا۔ لیکن آخر کار اس کا سہاگ ہمیشہ کے لئے لوٹ لیا۔

دِلّی کے لئے یہ دَور آزادی بھی لایا۔ لیکن یہ دور اگر ایک طرف اجنبی راج سے نجات کا نقیب تھا تو دوسری طرف دِلّی کے لوگوں پر تلنگوں کے ظلم کا پیغام بر بھی تھا۔ یہی نہیں، خود دِلّی کے لوگوں نے لوٹ کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ سقّے راہِ فرار اختیار کر گئے۔ حلال خور غائب ہو گئے۔ اناج چور بازار میں چلا گیا۔ روزمرّہ کی ضرورت کی شدید قلّت ہوئی۔ رنگین مزاجانِ شہر پان کو ترسنے لگے۔ کہ ایک پان کی قیمت دو روپے تھی۔ مشکلات اتنی بڑھیں کہ انقلاب کے علامتی رہنما

بہادر شاہ ظفر نے یہ فرمان جاری کیا :-

"اکثر اہلِ سیف و اہلِ زور رعایائے شہر اور نمک پروردگانِ شاہی کو ستاتے ہیں۔ اور تکلیف دیتے ہیں۔ پہلے اس سے اہلِ فرنگ حسبِ دل خواہ اپنے، جو احکام چاہتے تھے جاری کرتے تھے۔ اور رعایائے عزیز ما بدولت ہمیشہ پریشان حال اور حیران رہتی تھی۔ اب تم لوگ انھیں ستاتے ہو۔ اور لوٹتے ہو۔ اگر ایسا ہی تمہارا حال ہے، تو خیر اس آخری وقت میں ما بدولت کو کچھ ملک و مال سے غرض نہیں۔ بہ طرف خواجہ صاحب حضور نہضت فرمائیں گے کہ رعایائے حضور بھی سب ہم رکاب اپنے آقائے ولی نعمت کے چلی جائے گی۔ اور یا بہ طرف کعبۃ اللہ ہجرت فرماویں گے کہ بقیہ عمرِ عزیز صورتاً و معناً و سراً و علانیۃً یادِ الٰہی میں بسر ہو جائے"

("دہلی اردو اخبار" جلد ۱۹ نمبر ۲۱-۲۴ مئی ۱۸۵۷ء)

ایسے میں کوئی دل گردے والا صحافی ہی سچی بات کہتا ہے۔ کیونکہ جب غنڈوں کو سیادت حاصل ہو جائے۔ نراج کی کیفیت ہو۔ تو عام لوگ اپنی جان اور عزت بچانے کے لئے سر لپیٹ کر ایک گوشے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یا غنڈوں کا ساتھ دے کر خود بھی لوٹ مار میں شریک ہو جاتے ہیں۔ لیکن مولانا محمد حسین آزاد نے ایسا نہ کیا۔ انھوں نے کمال بے باکی سے لوٹ مار اور غنڈہ گردی کی مذمت کی۔ بار بار انقلاب پسندوں پر زور دیا کہ وہ اپنی صفوں میں انتشار نہ پیدا ہونے دیں۔ نظم و نسق کو بہتر بنائیں۔ ہر کسی کی جان اور مال کی حفاظت کریں تاکہ اجنبی راج کے خلاف بغاوت کو آخر کار کامیابی نصیب ہو۔ ان کی مساعی بار آور

ہوئیں یا نہیں۔ یہ الگ بات ہے ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اور پھر گھٹا ٹوپ تاریکی چھاگئی۔ دِلّی کا سہاگ اُجڑ گیا۔ شرافت مٹی میں مل گئی۔ رذالت کا سر اونچا ہوا۔ " دہلی اردو اخبار" موت کے گھاٹ اتر گیا۔ اس کا مالک محمد باقر گولی سے اُڑا دیا گیا۔ لیکن وہ زندۂ جاوید ہو گیا کہ برِّعظیم میں وہ پہلا صحافی تھا جسے رتبۂ شہادت نصیب ہوا ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مِل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اس اخبار کے مدیر آزادؔ کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے۔ اور اعلان ہوا کہ جو اُسے گرفتار کرائے گا اُسے پانسو روپے کا انعام ملے گا۔ لیکن یہ انعام کسی کو نہ مل سکا۔ آزادؔ انتہائی بے سر و سامانی کی حالت میں دہلی سے نکلے۔ پیدل چلتے اور قوت لایموت کے لئے محنت مزدوری کرتے لکھنؤ پہنچے۔ کچھ دیر قیام کیا۔ پھر مدراس گئے۔ وہاں سے بمبئی پہنچے۔ بمبئی سے سنگرور گئے۔ وہاں سے لدھیانہ آئے۔ چند ماہ سید رجب علی شاہ کے اخبار " مجمع البحرین" میں کام کیا۔ پھر شہرِ لاہور کا رُخ کیا۔ پہلے سررشتۂ تعلیم میں ایک چھوٹی سی ملازمت کی۔ آہستہ آہستہ جوہر کھلے۔ ایک طرف یونیورسٹی کالج میں عربی اور فارسی کی پروفیسری ملی۔ دوسری طرف صحافت نے اپنے چھنے ہوئے فرزند کو پھر آغوش میں لے لیا۔ لیکن یہ وہ طوفانی صحافت نہیں تھی جس سے آزادؔ کا قلم آشنا تھا۔ اس صحافت کی بساط تو مدت ہوئی اُلٹ چکی تھی۔ اب صحافت نرم رَو، معتدل، اور سرد مزاج تھی اور

طرّہ یہ کہ حکومت کے سائے میں پرورش پا رہی تھی، آزاد کا جوش بھی امتدادِ زمانہ سے ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ دو انگریز مستشرقین، ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائڈ کی مساعی نے اُنھیں اس قابل بنا دیا کہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر گیسوئے علم و ادب کو سنوارنے اور اس کی تابناکیوں میں اضافہ کرنے کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔

۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر لائٹنر کی صدارت میں ایک انجمن قائم ہوئی جس کا نام "انجمن اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب" تھا۔ اس میں پنجاب کی مشہور ہندو، مسلم اور سکھ شخصیتیں شامل تھیں۔ مولانا آزاد بھی اس کے رُکن تھے اسی انجمن کے زیرِ اہتمام پنجاب یونیورسٹی کالج قائم ہوا۔ اور اسی کی پیہم مساعی سے پنجاب یونیورسٹی بنی۔

۱۸۶۵ء میں انجمن کے زیرِ اہتمام ایک مجلّہ جاری ہوا جس کا نام "رسالہ انجمن اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب" رکھا گیا۔ یہ رسالہ ۱۸۷۰ء کے اوائل تک جاری رہا۔ اس کے اولین مدیر مولانا آزاد تھے۔ اور ان کے مضامین تو اس میں اُن دنوں بھی چھپتے رہے، جب وہ مدیر نہیں تھے۔ اس زمانے میں حکومت نے "اتالیق پنجاب" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ جس کے مدیر منشی پیارے لال آشوب اور نائب مدیر مولانا محمد حسین آزاد تھے۔ یہ رسالہ یکم جنوری ۱۸۷۰ء کو نکلا۔ اور اس میں صرف علمی مضامین چھپتے تھے۔ اس دوران میں انجمن اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب کا مختصر نام "انجمنِ پنجاب" قرار پایا۔ انجمنِ پنجاب نے رسالہ بند کرکے "ہمائے پنجاب" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا اور میجر ہالرائڈ نے مولانا کو اطلاع دی کہ گورنر پنجاب نے انھیں اجازت دی ہے

کہ وہ گورنمنٹ کالج کی ملازمت کے ساتھ ساتھ اس اخبار کی ادارت کریں۔ مولانا نے کچھ عرصہ یہ کام کیا۔ لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا کہ انھیں ادارت سے الگ ہونا پڑا۔ بات یہ ہوئی کہ مولانا نے سیالکوٹ سے آیا ہوا ایک مراسلہ اخبار میں چھاپ دیا۔ جس میں ڈاک کی بدنظمیوں کی شکایت تھی۔ پوسٹ ماسٹر جنرل کے پاس اس کا تراشہ پہنچا۔ تو اُسے بہت غصّہ آیا۔ اُس نے ڈاکٹر لائٹنر سے شکایت کی۔ چونکہ حکومت اس بے تکلفی کی روادار نہیں تھی۔ کہ اُس کے اپنے اخبار میں اس کے خلاف کوئی مراسلہ چھپے اس لئے ڈاکٹر لائٹنر نے مولانا کو الگ کر دیا۔ لیکن یہ علٰحدگی بڑی خوبصورتی سے عمل میں آئی۔ ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر لائٹنر کا مکتوب مولانا کے نام:-

"مائی ڈیر مولانا

آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ میں مولوی محمد لطیف سے یہ بندوبست کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں کہ وہ 'ہمارے پنجاب' کی ادارت سنبھال لیں۔ اس سے آپ کو یہ آسانی ہوگی کہ زیادہ اہم کاموں کی طرف توجہ دے سکیں گے۔ بہرحال مجھے توقع ہے کہ آپ جب کبھی آسانی کے ساتھ اس کام میں امداد دے سکیں، ضرور دیں۔ ازراہِ کرم مولوی محمد لطیف کو چارج دے کر مجھے ممنون فرمائیں۔

آپ کا مخلص

لائٹنر

صدر انجمنِ پنجاب"

۱۵ر فروری ۱۸۷۱ء

لیکن مراسلہ چھاپنے کے جرم کی بِنا پر انھیں مدتوں پریشان رہنا پڑا۔ اور کئی مہینوں تک جواب طلبی کا سلسلہ جاری رہا۔ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں مولانا کے خلاف کوئی سازش بھی کارفرما تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے اخبار "کوہِ نور" کے مالک اور مدیر منشی ہرسکھ رائے نے جو لاہور کے رؤسا میں شمار کئے جاتے تھے۔ مولانا کے نام یہ خط لکھا۔

"جناب مولوی صاحب مخدوم

اب وقت یہ آن پہنچا ہے کہ اہتمام ایڈیٹری 'کوہِ نور' جناب اپنے قبضے میں لے لیں۔ اور بندہ صیغۂ مینجری کو اپنے قبضے میں لے کر اندرونی تائیدات میں تحریکیں کرے۔ اور تھوڑے سے عرصے میں دشمنانِ بدگو اور بددہن کا منہ سُرخ کیا جائے۔

جناب کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

ہرسکھ رائے"

اگرچہ مطبع کوہِ نور ایک پُروقار ادارہ تھا اور منشی ہرسکھ رائے لاہور کے نمایاں ترین اخبار نویس اور بہت بااثر شہری تھے۔ لیکن مولانا کو غالباً یہ منظور نہیں تھا۔ کہ وہ اپنی پُرسکون علمی زندگی کو چھوڑ کر آزاد صحافت کے خارزار میں قدم رکھیں۔ اس لئے اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔

ادھر "ہمائے پنجاب" کی زندگی بہت مختصر ثابت ہوئی اور ۱۸۷۱ء میں اسے بند کر کے انجمن پنجاب نے "اخبار انجمنِ پنجاب" نکالا جو نہایت اعلیٰ پائے کا اخبار تھا۔ اس کا ایک فائل پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ جس میں ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء تک کے متفرق پرچے موجود ہیں انھیں دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد بھی کچھ عرصہ اس کے مدیر

رہے۔ لیکن میرے پاس اس کا کوئی حتمی ثبوت تاحال موجود نہیں۔ بعض ادبی مورخین اس غلط العام بیان کو دہراتے رہے ہیں۔ کہ ڈاکٹر لائیٹز کے تعاون سے مولانا آزاد نے ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی جس کے زیر اہتمام نیچرل شاعری کے مناظمے منعقد ہوئے۔ یہ غلط ہے۔ انجمنِ پنجاب حقیقت میں وہی انجمنِ اشاعت مطالبِ مفیدہ پنجاب تھی۔ جس کی بنیاد ۱۸۶۴ء میں رکھی گئی۔ چونکہ السنۂ شرقیہ اور اردو ادب کا فروغ اس کے مقاصد میں داخل تھا۔ اس لئے مناظموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں مولانا آزاد پیش پیش تھے۔

مولانا آزاد کی مضمون نگاری خوب جاری رہی۔ رسالہ انجمنِ مفیدِ عام قصور میں ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک ان کے مضامین کے عنوان یہ تھے:-

۱۔ زمانۂ سابق میں ہندوستانیوں کے طور طریقے کیا ہیں؟

۲۔ سفرِ سکندرِ اعظم ہندوستان میں

۳۔ شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار

۴۔ راجہ بیربر

۵۔ مضمون زبانِ اردو (بالاقساط)

۶۔ نظمِ اردو کی تاریخ (بالاقساط)

"اخبارِ انجمنِ پنجاب" میں بھی اکثر مضمون درج ہوتے تھے۔ مضمون نگاری کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ۱۳ راپریل ۱۸۷۷ء کو سفیر ہندوستان (امرتسر) کے مدیر رجب علی نے مولانا سے مضمون کی فرمائش کی۔ اور اگلے سال تک جب مضمون نہ ملا۔ تو خط لکھا کہ یا تو مضمون دیں۔ ورنہ اخبار کا چندہ ادا کریں۔

۱۸۵۷ء میں مولانا کی سیاسی مضمون نگاری ختم ہو چکی تھی۔ لیکن ۱۴ اگست ۱۸۸۸ء کو گورنر پنجاب کے پرائیوٹ سیکرٹری کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے "نیشنل کانگرس اور پنجاب" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر گورنر کے نام بھیجا۔ جسے گورنر نے نہایت دلچسپی سے پڑھا۔

لاہور میں آمد کے بعد ان کی مضمون نگاری کا آغاز اُن مقالوں سے ہوا جو انھوں نے ۱۸۶۵ء کے آغاز تک انجمنِ پنجاب میں پڑھے۔ ڈاکٹر لائیٹز نے ایک خط میں ان مضامین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔ کہ مولانا کو اپنے موضوعات پر اتنا کامل عبور تھا اور اُن میں تنقید کی ایسی قوت موجود تھی جس کی توقع ایک یورپی سکالر سے کی جا سکتی ہے۔

(اس مقالے میں جن دستاویزات کا حوالہ دیا گیا ہے
وہ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد کی نوازش سے زیر مطالعہ آئے)

جب دلّی میں غدر پڑا

وقائع نگاروں کی زبانی

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں عروس البلاد دِلّی پہ کیا گذری؟ یہ ایک ایسا موضوع ہے۔ جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس کا ایک پہلو عام لوگوں کی نظر سے اوجھل ہے۔ جب دِلّی سے انگریز نکالے گئے۔ اور سارے برِ اعظم میں بغاوت کی آگ کے الاؤ روشن تھے۔ انگریزوں نے دِلّی میں اپنے خفیہ وقائع نگار مقرر کر دیئے۔ تاکہ وہ وقتاً فوقتاً انقلاب پسندوں کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوتے رہیں۔ ان وقائع نگاروں نے جو خبرنامے مرتب کر کے انگریزوں کو بھیجے وہ فارسی میں ہوتے تھے۔ اور بعد میں اُن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر لیا جاتا تھا۔ ان خبرناموں میں سے چند کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ ہر ذیلی عنوان میں پہلے خبرنامے کی تاریخ دی جائے گی۔ اور پھر خطوطِ وحدانی کے اندر وقائع نگار کا نام درج کیا جائے گا۔ ان خبرناموں کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ حقیقت میں یہ قلمی اخبار تھے۔ نیز یہ بھی پتہ چلے گا کہ دِلّی میں کیا کچھ ہوتا رہا۔ اور وہ کون سے

عناصر تھے جنھوں نے انقلاب پسندوں کی ساری مساعی کو مٹی میں ملا دیا

۴ر جولائی (ہرچند گوسائیں)

۱۔ اجمیری دروازے کے قریب ایک توپ نصب کردی گئی ہے۔ دہلی دروازے کے قریب میں نے روہیل کھنڈ سے باغیوں کی فوج آتی دیکھی۔ اس میں پیدل فوج کی پانچ رجمنٹیں، گھوڑسواروں کی ایک رجمنٹ، نوتوپیں، آٹھ سو گھوڑے اور نو لاکھ روپے کا خزانہ تھا۔ روہیل کھنڈ کے چار سو غازی بھی شریک تھے۔

۲۔ ہانسی سے ایک انگریز افسر اپنے کنبے سمیت دہلی آیا۔ اور اُس نے اسلام قبول کر لیا۔

۳۔ معلوم ہوا ہے، اس وقت دہلی میں نو یورپی باشندے چھپے ہوئے ہیں۔

۴۔ پندرہ سپاہی ڈیڑھ ہزار روپے کی رقم لے کر بھاگنے کو تھے کہ دوسرے باغیوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔

۵۔ گوسائیں نے بعض باغی سپاہیوں سے پوچھا۔ تم انگریزی حکومت کی خدمت میں معافی کی درخواست کیوں نہیں دے دیتے؟ بولے انگریز چاہتے تھے کہ ہم ناپاک کارتوسوں کو اپنے دانتوں سے کاٹیں اور اب وہ نہ ہمیں زندہ چھوڑیں گے نہ ہمارے خاندانوں کو۔

۶۔ شہر میں آٹا روپے کا بائیس سیر، گندم انتالیس سیر، گھی دو سیر، شکر سات سیر اور گڑ نو سیر بکتا ہے۔

۵ر جولائی (ہرچند گوسائیں)

۱۔ باغی فوج میں مشہور ہے کہ انگریزوں کے پاس روپیہ نہیں رہا۔ بارود تقریباً ختم ہے اور ان میں بیماری عام ہے۔

۲۔ خبر ملی تھی۔ کہ انگریز زخمیوں اور بیماروں کا ایک قافلہ انبالہ جا رہا ہے۔ اور فیروز پور سے گیارہ لاکھ کا خزانہ آ رہا ہے۔ اس پر روہیلوں کا دستہ تعاقب میں گیا۔ اس وقت بارہ بجے ہیں۔ اور ابھی تک پینتیس زخمی سپاہی لوٹے ہیں۔

۳۔ مرزا مغل کی نگرانی میں گولہ بارود کی تیاری کے لئے وسیع اہتمام ہو رہا ہے۔

۴۔ ایک شخص بہادر خاں نامی، جس کی ڈاڑھی سُرخ ہے۔ برطانوی کمپ سے ہو کر آیا ہے اور اُس نے ساری معلومات باغی فوج کے افسروں تک پہنچا دی ہیں۔

۵۔ بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ شہر میں اناج کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا جائے

۶۔ باغیوں کو اطلاع ملی ہے کہ بلبھ گڑھ کا راجہ انگریزوں کا طرف دار ہے۔ اس لئے وہ راجہ کو سزا دینے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

۷۔ گوکل چند منشی نے باغیوں کو انگریزی کمپ کا ایک فرمان پڑھ کر سنایا۔ اس پر باغیوں کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے فرمان کے پُرزے پُرزے کر دیئے۔ اور منشی کو حکم جاری کیا۔ خبردار اس فرمان کا مضمون کسی تک نہ پہنچنے پائے۔ ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

۸۔ اب آٹا روپے کا سولہ سیر، گندم چھبیس سیر۔ نخود انیس سیر اور گھی ڈیڑھ سیر ملتا ہے۔

۹۔ جن دیہاتیوں کے مکان انگریزوں نے جلا دیئے۔ اور اُن کی بیویوں کی عصمت دری کی انھوں نے بادشاہ اور فوج سے فریاد کی۔ اس پر باغیوں نے یقین دلایا کہ وہ جانیں قربان کر دیں گے لیکن انتقام لئے بغیر نہیں رہیں گے۔

۱۰۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کچھ کشیدگی شروع ہوئی تھی پر اب قابو پالیا گیا ہے۔

۱۱۔ بادشاہ اکثر باغیوں کو ان کی شکست پر لعن طعن کرتا ہے۔ اور وہ اُسے یہ کہہ کر خاموش کر دیتے ہیں۔ کہ ہماری فوج روز بروز بڑھ رہی ہے۔ انگریزی فوج کو کمک نہیں ملتی۔ اس لئے آخر کار ہماری جیت ہوگی۔

۸ ر جولائی (نامعلوم)

۱۔ گولہ بارود تیار ہو رہا ہے۔ نئی تلواریں بنائی جا رہی ہیں۔ ہر شام جامع مسجد میں ہتھیاروں کا بازار لگتا ہے۔

۲۔ پہلے سپہ سالارِ اعظم کے عہدے پر بختیار خاں فائز تھا۔ لیکن اب وہ اپنے پرانے عہدے یعنی روہیل کھنڈ بریگیڈ کی سپہ سالاری پر واپس چلا گیا ہے۔

۳۔ جتنا خزانہ موجود تھا۔ وہ سب صَرف ہو چکا ہے۔ اب نواب آف جھجھر، راجہ آف بلبھ گڑھ اور شہر کے صرافوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ روپیہ جمع کریں۔

۴۔ مجاہدین زیادہ تر اُن مجرموں پر مشتمل ہیں جو حال ہی میں رہا ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ایک شخص طالب علی کی رہنمائی میں جامع مسجد میں مقیم ہیں اُدھر ایک شخص گلزار علی (امروہہ کا رہنے والا) نے ایک ہزار بدمعاشوں کو لے کر شہر کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا ہے۔ مجاہدین کے گروہ میں چند بدمعاشوں کے سوا اور کوئی شامل نہیں ہوا۔

۵۔ بادشاہ نے دو شعر لکھے ہیں۔ ایک میں اپنی حالت بیان کی ہے اور ایک میں انگریزوں کی حالت۔

اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

فوج نے مجھے گھیر رکھا ہے
مجھے نہ امن ملتا ہے نہ چین
اور صرف جان سلامت ہے
جو وہ جلد لے لیں گے

ایرانی فوجیں اور روسی عساکر
انگریزوں پر فتح نہ پا سکے
لیکن ایک ناپاک کارتوس نے
اُن کے اقتدار کی بنیادیں ہلادی ہیں

۲۲ر جولائی (محی الدین)

۱۔ بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ متھرا کے مُنی رام سے ایک کروڑ روپیہ وصول کیا جائے اور ربیع کی فصل کی پہلی قسط بھی حاصل کر لی جائے منی رام کو آزاد شدہ علاقے کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا ہے۔

۲۔ جھجھر کے نواب اور بلبھ گڑھ کے راجہ کے نام خطوط میں تعاون اور امداد طلب کی گئی ہے۔ جو ایلچی جھجھر بھیجا گیا تھا وہ واپس آگیا ہے۔ خیال ہے وہ خزانہ نہ لانے کے بہانے پیش کرے گا۔

۲۸ر جولائی (نامعلوم)

۱۔ سراج الدین ٹونکی نے مجاہدین کی مردم شماری کی تو معلوم ہوا۔ ان کی تعداد سات ہزار ہے۔

۲۔ افواہ مشہور ہے کہ بمبئی کی باغی کمک اور راجہ جودھ پور کے عساکر

میں تصادم ہوا۔ لیکن ابھی اس خبر کی تصدیق نہیں ہوئی۔

۳۔ ہانسی سے خبر آئی ہے کہ آٹھ ہزار یورپی عسکریوں نے شہر کے قلعے پر قبضہ کرلیا ہے۔ لیکن یہ خبر درست معلوم نہیں ہوتی۔

۴۔ حکیم عبدالخالق گوڑگاؤں کا ناظم مقرر ہوگیا ہے۔ چھ تحصیلدار اور سولہ کوتوال مقرر ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی اپنی نوکری پر نہیں گیا۔

۵۔ نواب زینت محل بیگم نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔ اس نے جنرل بخت خاں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انگریزوں کے پہاڑی توپ خانے پر قبضہ کرلے تو اسے نہ صرف سپہ سالارِ اعظم بلکہ ہندوستان کا گورنر جنرل بھی مقرر کر دیا جائے گا۔

۶۔ شہزادہ مرزا جمہ بخت سے وعدہ کیا گیا ہے کہ بہادر شاہ کے بعد سلطنت اُسے ملے گی۔

(اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اپنے چھوٹے بھائی کو معمولی سی تنخواہ پر جنرل بخت خاں کے دفتر میں ملازم کرادوں، اس طرح ہمیں تمام مستند خبریں حاصل ہو جایا کریں گی۔ لیکن مجھے آپ کی تحریری اجازت کی ضرورت ہے)

۷۔ مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ انگریزی کیمپ پر حملہ ہوگا۔ اور اس میں ایک رجمنٹ کے سوا باقی ساری باغی فوج حصّہ لے گی۔

(جنگی مشاورتی مجلس کا اجلاس ہو رہا ہے۔ اس کے نتیجے سے میں آج شام آگاہ ہو جاؤں گا۔ اگر کوئی شخص رات کے وقت میرے ہاں آجائے تو اُسے صبح سویرے خبریں دے کر روانہ کیا جا سکتا ہے)

۲۹ر جولائی (رجب علی)

۱۔ باغی فوج کے ہندو سپاہیوں نے پانچ قصابوں کو گائے ذبح کرنے کے جرم میں ہلاک کر دیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اور کشیدگی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بادشاہ نے اسے روکنے کے لئے گائے بلکہ بکری کے ذبیحہ پر بھی پابندی لگا دی ہے کٹر مسلمان اس پر نہایت ناراض ہیں۔ انھوں نے عہد کیا ہے کہ وہ عید کے دن بھرے بازار میں گائے کی قربانی دیں گے۔ اور اگر ہندو سپاہیوں نے روکنے کی کوشش کی تو اُن سے برسرِ پیکار ہو جائیں گے یا فتح حاصل کریں گے یا رتبۂ شہادت۔ وہ کہتے ہیں کہ گائے کی قربانی کے لئے کفار سے جنگ میں مارا جانا اتنا ہی احسن ہے جتنا فرنگیوں سے لڑائی میں شہادت پانا۔ ان کا بیان ہے کہ ہم پہلے یہ جھگڑا طے کریں گے اور پھر فرنگیوں کے خلاف ہتھیار اُٹھائیں گے۔ اس امر کا کافی امکان موجود ہے کہ عید کے دن باغیوں میں خونریزی اور جنگ ہو۔

۲۔ حکیم احسن اللہ خاں سپاہیوں کی رقم میں غبن کرتا ہے اور فی کس دس روپے کی جگہ صرف چار روپے دیتا ہے۔ سپاہی بالکل خفا ہیں۔ اور وہ اُس کی جان لے لیں گے۔

۳۔ سپاہیوں کے ۴، ویں اور ۵۴ ویں دستے کے پاس پانچ سو من بارود موجود ہے۔ لیکن وہ بارود کسی کو نہ دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ بغاوت برپا کرنے کے جرم میں خواہ ہماری جانیں لے لی جائیں، لیکن ہم بارود کو ہنگامی ضروریات کے لئے محفوظ رکھیں گے۔ چار سو من کچا قلمی شورہ تو موجود ہے لیکن دلی میں گندھک نہیں ملتی۔

۴۔ دِلّی کے تمام معزز لوگ سخت دہشت زدہ ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ اس جد وجہد میں ان کی جانیں سلامت نہیں رہیں گی۔

۵۔ نواب حامد علی خاں اور مفتی صدرالدین کے مکانات پر پہرا بٹھا دیا گیا ہے۔

۶۔ دہلی میں مقیم وقائع نگار نے بادشاہ کو تجویز پیش کی کہ وہ شہر کے دروازے کھول دے اور انگریزی فوج کو داخل ہونے دے۔ اس کی اپنی جان شاید چلی جائے لیکن اس کے خاندان کے حقوق تو برطانیہ پر ضرور ہوں گے۔ بادشاہ راضی ہو گیا۔ لیکن حکیم احسن اللہ خاں نے مداخلت کر کے اس منصوبے پر عمل نہیں ہونے دیا۔

۲۹ر جولائی۔ دوسرا ایڈیشن (نامعلوم)

۱۔ نیمچ فوج کے جرنیل نے بادشاہ سے ملاقات کی اور دو لاکھ کارتوس، دو سو انگریزی کاٹھیاں، چار سو پستول اور ایک قلعہ شکن توپ مانگی۔ اس کے جواب میں اُسے ڈیڑھ سو تلواریں، پچاس کاٹھیوں اور پچاس ہزار کارتوسوں کا وعدہ ملا۔ وہ اس پر بہت مایوس ہوا۔ اور حملہ ملتوی کر دیا۔ اس لئے جو حملہ کل پہاڑی توپ خانے پر ہونا تھا۔ وہ کوئی دوسرا دستہ کرے گا۔

۲۔ ایک تہ خانہ میں کچھ راکٹ ملے۔ اور تیرہ ٹونکی مجاہدین نے وعدہ کیا کہ وہ یہ راکٹ چلائیں گے۔

۳۔ علی پور کی طرف سے ابھی تک نقل وحرکت ملتوی ہے۔ لیکن دریا کے پار کسی جگہ مورچہ بنانے کا چرچا ہے۔ بہرحال ان لوگوں کے منصوبے شاذ ہی عمل میں آتے ہیں۔

۴۔ بریلی کے باغی دل چھوڑ بیٹھے ہیں اور تنخواہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔

۵۔ ہر روز پندرہ من بارود تیار ہوتا تھا لیکن پچھلے دنوں بارش کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھ دن میں صرف بیس من بارود تیار ہوا۔ گولہ بارود کی کمی کی وجہ سے فصیل کی توپوں سے گولے چھٹنے بند ہو گئے ہیں۔ اب ہر مورچے میں چھ اعلیٰ درجے کے نشانچی مقرر کیے گئے ہیں۔ جو دستی بندوقوں سے آتش باری کرتے ہیں۔ گندھک نایاب ہے اور کوئی حاصل کرنے کی تدبیر نہیں کرتا۔ اس لیے چند روز تک بارود بننا بالکل رک جائے گا۔ بہرحال ایک لاکھ کارتوس بن گئے ہیں اور کل سے استعمال کیے جائیں گے۔

یکم اگست (نامعلوم)

۱۔ تیس جولائی کو برطانوی توپ خانے کی گولہ باری سے شہر کو بہت نقصان ہوا۔

۲۔ ادھر ذخیرۂ حرب کم ہو رہا ہے۔ صرف پچاس من گولہ بارود تیار تھا۔ سو وہ سارا تقسیم ہو چکا ہے۔ باقی جتنا بارود تھا وہ گیلا ہو کر خراب ہو گیا ہے۔

۳۔ سپاہی ہر روز چھوٹی چھوٹی بات پر لڑتے ہیں۔

۴۔ جو فوج علی پور بھیجی گئی، اس کے سپاہی جانے پر راضی نہیں تھے۔

۵۔ شہر کے باغی اناج کی قلت کی وجہ سے بہت تنگ آئے ہوئے ہیں اور بھاگنے کی سوچ میں ہیں۔

۷ر اگست (گوری شنکر)

۱۔ ساری فوج بے حوصلہ ہو رہی ہے۔ جنرل بخت خاں اور جنرل سردار سنگھ اب بھی ایک دوسرے کے کھلے دشمن ہیں۔ فوجیوں کو شبہ ہے کہ بخت خاں انگریزوں سے ملا ہوا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں پر بھی شبہ ہے لیکن وہ بادشاہ کی مہربانی کے طفیل بچا ہوا ہے۔

۲۔ جھجر کے نواب کو باج کی ادائی کے لئے سخت پیغام بھیجا گیا ہے۔

۳۔ شہر سے روپیہ جمع کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے۔ اس کی نگرانی شہزادہ مرزا مغل کے سپرد ہے۔ کل پنجابی تاجروں نے چالیس ہزار روپے کی رقم ادا کی۔ اور چندے بھی آرہے ہیں۔

۴۔ بادشاہ نے کھلے دربار میں اعلان کیا کہ ہندوستان کے نقشے سے انگریز کا نام مٹا دیا گیا ہے۔ جو چند بیوقوف لوگ ابھی تک انگریز کی واپسی کے متوقع ہیں وہ خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ بنگال، مدراس اور بمبئی ـــ سب مقامات پر بغاوت کامیاب ہو رہی ہے۔ اگر انگریزوں نے انگلستان سے کمک منگوائی تو اپنا ملک بھی کھو بیٹھیں گے۔ اب انگریزوں کا کوئی دوست نہیں رہا۔ اور بے شمار لوگ ہمارے احکام کے تابع ہیں۔

۵۔ کل فوجیوں نے حکیم احسن اللہ خاں کا مکان لوٹا۔ پھر اسے جلا دیا حکیم قلعہ میں نظر بند ہے۔ فوجیوں نے اس کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر بادشاہ نے اسے حوالے نہ کیا تو خود اس کی اپنی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ آخر کار بادشاہ نے حکیم کو فوجیوں کے حوالے کر دیا۔ اور ساتھ ہی انتباہ کیا کہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

۶۔ نواب زینت محل بیگم بھی زبردست شکوک کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ شہر کے مسلمان کہتے ہیں۔ اگر بادشاہ مارا گیا تو ہم بھی باقی نہیں رہیں گے آج کوئی شخص محل کی طرف نہیں گیا۔ ہر شخص اپنے گھر بیٹھا ہے۔ اور دکانیں بند ہیں۔ زینت محل کا مکان زبردست پہرے کی وجہ سے لوٹ مار سے بچا ہوا ہے۔

۷۔ بارود خانے میں زبردست دھماکہ ہوا۔ پانسو مزدور ہلاک ہوگئے

اور ایک سو بُری طرح زخمی ہوئے۔ رات کے وقت ان کے اعزہ و اقارب اپنے ہلاک شدگان کی نعشیں ڈھونڈتے رہے۔ یہ حادثہ بالکل اتفاق سے ہوا۔ حکیم احسن اللہ خاں کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ ساری رات جھگڑا جاری رہا۔ کسی شخص کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ اور محل کے دروازے بند ہیں۔

۸ راگست (نامعلوم)

۱۔ جنرل بخت خاں نے اپنی فوج کا ایک دستہ مالیہ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ اس پر دوسرے جرنیلوں کو غصہ آیا۔ اُنھوں نے بادشاہ کے نام ایک عرض داشت میں مطالبہ کیا۔ کہ جب تک فوج کے تمام رہنماؤں میں اتفاق نہ ہو' مزید ایسی اجازت کسی کو نہ دی جائے اس وجہ سے بہت سے جھگڑے اُٹھے ہیں جن کا انجام نظر نہیں آتا۔

۲۔ بیس دن سے کسی کو تنخواہ نہیں ملی۔ فوجی بآوازِ بلند شاکی ہیں۔ اور واپسی کا ارادہ کر رہے ہیں۔

۳۔ بادشاہ کے ملازم شہریوں سے جبراً روپیہ وصول کرتے ہیں۔

۴۔ چودہ ہندوؤں اور چودہ مسلمانوں پر مشتمل ایک مجلس مقرر ہوئی ہے جو شہریوں کے ذمّے رقوم کی تشخیص کرے گی اور وصول بھی کرے گی۔

۱۴ راگست (نامعلوم)

۱۔ ۱۳ راگست کو حکیم احسن اللہ خاں نے اس شرط پر رہائی پائی کہ وہ صرف شاہی معالج کے فرائض ادا کرے گا۔ اور بس۔ مرزا مغل عبداللہ اور خضر سلطان نے اُسے گھر پہنچایا۔

۲۔ بادشاہ غمگین ہے اور باغی لشکر میں لوٹ مچا رہے ہیں۔

۳۔ باغی افواج میں پھوٹ پڑنے والی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہیں۔

الف۔ تنخواہیں نہیں دی جاتیں۔

ب۔ فوج نے مرزا مغل کو سپہ سالارِ اعظم منتخب کیا ہے۔ اس پر باغیوں کے رہنما، بالخصوص بخت خاں بہت ناراض ہیں۔

ج۔ فوجی لڑائی سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔

۱۴ اگست (تراب علی)

دربار کے بعد بادشاہ نے فوج کے کمانڈر کو کہا "یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ تم انگریزوں کی اس چھوٹی سی فوج کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ جو کیمپ میں متعین ہے۔ اس لئے تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ ان سے رحم کی بھیک مانگو۔ اور شہر کو اور خود مجھ کو بربادی سے بچاؤ" کمانڈر نے جواب دیا کہ اب فرار کی کوئی صورت نہیں۔ اس پر بادشاہ نے ہاتھی منگوایا اور یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر انگریزی کیمپ میں جائے گا اور اپنی برأت حاصل کرے گا۔ فوجی افسروں نے بڑی مشکل سے اُسے منع کیا۔ اور حلف اُٹھایا۔ کہ ہم یا تو فتح حاصل کریں گے یا ہمیشہ کے لئے منہ چھپالیں گے۔

۱۸ اگست (گوری شنکر)

ہر روز حالات کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اب نہ باغیوں کے منصوبوں پر کوئی اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ نہ بادشاہ کی مجالس مشاورت کے فیصلوں پر۔ محل میں انتشار کا دور دورہ ہے۔ شہزادوں میں جھگڑے روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ زینت محل انگریزوں کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ لیکن وہ کچھ کرنے پر قادر نہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں کو طاق پر بٹھا رکھا ہے۔ مُہر شاہی

ہر شخص استعمال کر سکتا ہے۔ محل کے اندر ہزار ہا خبریں گھڑی جاتی ہیں جو شہر میں مشہور ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ اُن کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ بادشاہ، شہزادے، افسر، سبھی جعلی اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔

۲۰ر اگست (نامعلوم)

باغیوں کا حوصلہ بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ کسی دن اچانک دہلی سے بھاگ اٹھیں گے۔ ان کی تنظیم کا شیرازہ پارہ پارہ ہو رہا ہے روپیے اور گولہ بارود کی نازک حد تک کمی ہے۔ ہر روز فوج بادشاہ سے تنخواہ مانگتی ہے۔ وہ کہتا ہے: "میرے پاس روپیہ کہاں سے آیا؛ میں نے تمہیں نہیں بلایا تھا۔ نہ اب مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں گورنمنٹ سے پنشن لیتا تھا۔ تم نے مجھے انگریزوں کی نظر میں ہمیشہ کے لئے ذلیل کر دیا" اس پر باغی دھمکی دیتے ہیں کہ ہم محل لوٹ لیں گے۔

۲۸ر اگست (تراب علی)

جب سے الور کے مولوی فضلِ حق یہاں آئے ہیں انھیں شہریوں میں انگریزوں کے خلاف جوش و خروش پیدا کرنے کے لئے بار بار استعمال کیا جا رہا ہے۔ مولوی فضلِ حق نے "آگرہ گزٹ" کا حوالہ دیتے ہوئے اعلان کیا۔ کہ انگریزی پارلیمنٹ نے حکم دیا ہے کہ دلی کا ایک شخص زندہ نہ بچنے پائے۔ اور سارا شہر برباد کر کے صرف جامع مسجد کا ایک مینار باقی رکھا جائے تاکہ آئندہ زمانوں میں لوگ اِسے دیکھ کر کہہ سکیں۔ کہ یہاں کبھی دلّی آباد تھا۔

۲ر ستمبر (گوری شنکر)

کل محل میں تنخواہ کے مسئلے پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ دو کمپنیوں نے بادشاہ کے کمروں کو محصور کر لیا۔ بادشاہ فوراً باہر نکلا صوبیداروں نے فوراً تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ بادشاہ نے جواب دیا "میں نے تمہیں کبھی نہیں بلایا۔ نہ مجھے اب تمہاری ضرورت ہے۔ نہ میرے پاس پیسے ہیں۔ کہ تمہیں دوں۔" اس پر صوبیداروں نے بہت شور مچایا۔ سلیم شاہ رسالدار نے انھیں خاموش کیا۔ بادشاہ نے کہا "میرے پاس چالیس ہزار روپے موجود ہیں۔ یہ لوگ بڑی خوشی سے لے لیں" صوبیداروں نے کہا "اتنی تھوڑی رقم سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔" بادشاہ بولا "مجھے بریلی کے نواب نے ایک سو ایک نقرئی مہریں پیش کی ہیں۔ میں وہ بھی دینے کو تیار ہوں" صوبیداروں کا اصرار قائم رہا۔ تو بادشاہ نے ملکہ اور شہزادوں کے زیورات کی پیش کش کر دی۔ پھر کرسی سے اُٹھا اور اپنا تکیہ صوبیداروں کے سامنے پھینک کر کہا۔ یہ بھی لے لو اس پر درباری بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے صوبیداروں کو وہاں سے نکلوا دیا۔

۲ر ستمبر (فتح محمد)

کل جب باغی افسروں نے بہت ہنگامہ کیا۔ تو بادشاہ نے انھیں چالیس ہزار روپے نقد دیئے۔ اور وعدہ کیا کہ تنخواہ کی باقی رقم پندرہ دن کے اندر اندر ادا کر دی جائے گی۔ اس رقم کے لئے یہ انتظام ہوا کہ مفتی صدرالدین مسلمانوں کی طرف سے اور لالہ مکند لال ہندوؤں کی طرف سے ضمانت دیں۔ کہ

وہ پندرہ دن کے اندر اندر ایک لاکھ روپیہ اکٹھا کر دیں گے دونوں نے ضمانت دے دی۔ کیونکہ اُنھیں توقع تھی کہ اُس وقت تک انگریز دہلی پر قابض ہو جائیں گے۔

۱۲ستمبر (تراب علی)

کل دیوانِ خاص کے گرد پانسو کے قریب فوجی افسر جمع تھے۔ مرزا مغل، ابو بکر اور خضر سلطان تینوں شہزادوں کو ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔ فوجیوں نے شور مچایا۔ "حکیم احسن اللہ ہماری تنخواہوں کے راستے میں دیوار بنا ہوا ہے۔ ہم اس کی موت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر یہ مطالبات منظور نہ ہوئے۔ تو ہم شہر کو آپس میں بانٹ کر روپیہ جبراً وصول کر لیں گے" مرزا مغل نے اپنی جان کو خطرے میں دیکھ کر مرزا الٰہی بخش کو بلایا۔ اُس نے افسروں کو سمجھایا بجھایا اور پھر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے اعلان کیا "میرے پاس کوئی روپیہ نہیں"۔ افسروں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو محل کو لوٹیں گے۔ شہر کو لوٹیں گے۔ اور سارے درباریوں کو ہلاک کر دیں گے" اس پر بادشاہ اٹھا اُس نے اپنا وہ تکیہ فوجیوں کے سامنے پھینک دیا۔ جس پر وہ دربار میں بیٹھا کرتا تھا۔ اور حکم دیا۔ کہ جاؤ۔ دربار کی ساری املاک ہاتھی، گھوڑے، بلکہ بیگمات کے زیورات تک ان لوگوں کے حوالے کر دو۔ اور پھر قبلہ نما ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پکار کر کہنے لگا "یا خدا! تو نے میرے گناہوں کی سزا خوب دی اگر انگریزوں کے ساتھ مجھے بھی قتل کر دیا جاتا۔ تو آج اس ذلّت سے سابقہ نہ پڑتا" اس چیخ و پکار سے سارے درباریوں

اور باقی اندرونِ ملک کی ۔ الٰہ آباد کی مقامی خبریں شاذ ہی دی جاتی تھیں

اس زمانہ میں آزادیٔ اظہار کا اتنا رواج نہیں تھا۔ بہرحال "قیصر الاخبار ہند" کبھی کبھی طنزیہ تبصرہ کر دیتا تھا ۱۳ر جنوری ۱۸۷۸ء کے شمارے میں "عہدۂ سول سروس" کے عنوان سے اُس نے بظاہر تو حکومت کی اس پالیسی کو سراہا کہ وہ سول سروس کے عہدے ہندوستانیوں کو نہیں دیتی ۔ لیکن سارا مضمون پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدیر محترم نے سب کچھ طنزیہ بیان فرمایا ہے۔ ۲۰ر جنوری ۱۸۷۸ء کے پرچے میں تو ایک تبصرے کا طنزیہ پہلو بہت نمایاں ہے۔ بات یہ ہوئی کہ بکسر کے مقام پر ایک میم صاحبہ اپنی ٹم ٹم میں سوار ہو کر جا رہی تھیں ۔ باجے کی آواز سن کر گھوڑا اڑ کا۔ میم صاحبہ خود اُتر کر بنگلے کے اندر چلی گئیں ۔ سائیس زمین پر اوندھے منہ گرا۔ اور گھوڑا بھاگا۔ اس کی زد میں کئی لوگ آئے ۔ نو عورتیں اور بچے سخت زخمی ہوئے ۔ اس پر اخبار رقمطراز ہے:

"اچھی طرح انصاف تو شاید ہی ہو۔ کیونکہ ایک میم صاحبہ مدعا علیہا ہوں گی ۔ سوائے اس کے ، دس یا بارہ عورتیں یا بچے ہندوستانی زخمی ہوئے ہیں۔ دس پانچ ہندوستانیوں کا خون تو ہر انگریز کے لئے مباح ہے ۔ اور اس موقعہ پہ کوئی ہلاک نہیں ہوا۔ (صفحہ ۱۲)

۱۸۷۷ء میں برِ عظیم کے اینگلو انڈین اخبارات نے اردو اخباروں کے خلاف مہم شروع کی ۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ان کو پابند کرنے کے لئے ایک خاص قانون نافذ کیا جائے ۔ کیونکہ یہ اخبار فساد اور بغاوت کی ترغیب دیتے ہیں اس پر تبصرے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"اب ہم مُشتے نمونہ از خروارے چند واقعات اور ان پر اردو اخباروں کی بحث کا ذکر کرتے ہیں۔ جس کو یہ انگریزی اخبار ترغیبِ فساد اور بغاوت خیال کرتے ہیں۔ کیا یہ امر لائق اس کے نہیں ہے کہ اردو اخبار اس پر حرف گیری کریں کہ جب ہندوستانی سول سروس کا امتحان دیں اور پاس ہو جائیں تو ان کو عہدے نہ ملیں۔ اور جب عہدے بھی بہ ہزار وقّت ملیں تو وہ بعد چند ہی عرصے کے ان سے خواہ مخواہ الگ کئے جائیں۔ اگر ضلع کے حکام چند در چند زیادتیاں اور صریح بے رحمیاں غریب بے کس ہندوستانیوں پر کریں۔ تو کیا یہ فساد انگیزی ہے؟ ہاں یہ البتہ فساد انگیزی ہے کہ سبیل دادخواہی کا انسداد کیا جائے۔ بابِ عدالت رعایا پر بند کیا جائے۔ دادخواہی سرکشی سمجھی جائے۔ انگریزی اخباروں کا یہ مطلب ہے کہ ہندوستانی انگریزوں کو دیوتا سمجھیں۔ تابعداری میں اس قدر مبالغہ ہو کہ انسانیت سے گذر جائیں۔ بڑے بڑے رئیس عالی خاندان صاحبِ حکومت چھوٹے چھوٹے انگریزوں سے سخت تکلیفیں اور ذلّتیں اٹھائیں مگر دم نہ ماریں۔ ورنہ سرکشی اور بے تہذیبی کا الزام ان پر قائم ہو۔" (۱۶؍ستمبر ۱۸۷۷ء صفحہ ۵)

۲۷؍اکتوبر ۱۸۷۷ء کو الٰہ آباد کے مشہور انگریزی اخبار "پائونیر" نے "ہندوستانی اخبارات کی سرکشی" کے عنوان سے ایک اداریہ قلمبند کیا۔ اس کے جواب میں ۴؍نومبر ۱۸۷۷ء کو "قیصرالاخبار ہند" نے ایک مضمون چھاپا جس میں "پائونیر" کی اس روش پر شدید نکتہ چینی کی کہ وہ ہندوستانی نامہ نگار نہیں رکھتا۔ اور لکھا کہ اس طرح "پائونیر" عوام کی رائے سے بے خبر

رہتا ہے اور حکومت کو گمراہ کرتا ہے ۲۴ر مارچ ۷۸ء کو ایک طویل اداریئے میں ورنیکلر پریس ایکٹ کے نفاذ پر احتجاج کیا۔ اور "پائونیر" کے اس بیان کی تردید کی کہ اردو اخباروں کے ایڈیٹر صرف "گلستان" اور "بوستان" پڑھے ہوتے ہیں۔

"احسن الاخبار"

ہفت روزہ "احسن الاخبار" ۶ر جنوری ۷۸ء کو حاجی محمد کبیر الحق نے الہ آباد سے جاری کیا۔ گویا یہ اخبار "قیصر الاخبار ہند" کے پورے ایک سال بعد نکلا۔ اس کا سائز، صفحات کی تعداد اور رنگ ڈھنگ بالکل اپنے ہم عصر کی طرح ہے۔ لیکن کتابت اور طباعت بہتر ہیں پالیسی ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"ملکی اور قومی خیر خواہی میں آزادانہ بحث کرتا ہے اور معاملاتِ ریاست ہائے ہندوستانی اور ممالکِ غیر پر بے غرضانہ رائے دیتا ہے۔ بے فائدہ اور بے نتیجہ بحثوں سے سروکار نہیں رکھتا تعصب اور بے وجہ طرف داریوں کے گرد نہیں پھرتا۔ راست گفتار اور صداقت نگار ہے جیسا کہ چاہیئے یہ ویسا ہی اخبار ہے۔

"کوئی مضمون یا خبر جو آدابِ تہذیب و تحریر اخبار کے خلاف ہوگی، بے مصلحتِ عام و وجہ خاص کے شائع نہ کی جائے گی ریاستوں کے احوال میں اگرچہ وقائع نگاری کی پابندی رہے گی مگر حتی الوسع مراتبِ مراعاتِ قومی و مدارجِ ملکی خیر خواہی سے تجاوز نہیں کیا جائے گا۔"

۱۳؍مارچ ۱۸۸۸ء کے شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ ورنیکل پریس ایکٹ کی زد سے بچنے کے لئے ایک اردو اخبار نے اپنا نصف حصہ انگریزی میں کر دیا۔ اور ایک انگریزی زبان میں نکلنے والے دیسی اخبار نے تمام اردو اخباروں کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اپنا آدھا حصہ انگریزی میں کر دیں اور اس طرح ورنیکلر پریس ایکٹ سے آزاد ہو جائیں۔

"احسن الاخبار" کے دس بارہ شماروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار "قیصر الاخبار ہند" کے مقابلے پر بہت اعتدال پسند ہے تبصرے سے اکثر پرہیز کرتا ہے۔ زیادہ تر خبریں ہی چھاپتا ہے۔ اور خبر دل کا رنگ وہی ہے جو "قیصر الاخبار" کا ہے۔ ۱۳؍مارچ کے شمارے میں "جام جمشید" کے نامہ نگار مقیم سورت کے حوالے سے یہ خبر دی ہے کہ سورت میں لائسنس ٹیکس کے خلاف تاجروں نے ہنگامہ کیا۔ ٹیکس کے اعلانات اتار کر کنوئیں میں پھینک دیئے۔ پولیس کو بے دست دپا کر دیا۔ اور سات ہزار اشخاص نے مظاہرہ کیا۔ ۱۴؍مارچ کو "ٹائمز آف انڈیا" کے حوالے سے خبر دی کہ چار روز تک شہر میں مکمل ہڑتال رہی ایک انگریز اسسٹنٹ مجسٹریٹ کی توہین کی گئی ایک آدمی ہلاک ہوا۔ اور چند زخمی۔ یہ خبریں اس لحاظ سے اہم ہیں کہ اس زمانے میں ایسے مظاہرے عام طور پر نہیں ہوتے تھے۔

آخر میں ایک خبر ملاحظہ ہو جو خلائی سفر کے اس دور میں دلچسپی کا موجب ہوگی:

سب سے بڑا غبارہ

"نمائش گاہ پیرس دار الحکومت فرانس میں

ایک اتنا بڑا غبارہ اُڑنے کا بنایا گیا ہے جس کا قُطر قریباً پانسو گز ہے۔ اور اس میں پانچ آدمی بیٹھ کر آسمان کی سیر کر سکتے ہیں۔ یہ غبارہ سب غباروں سے بڑا بنا ہے اس لئے عجائبات میں داخل ہے۔"

(۷ اپریل ۱۸۷۸ء صفحہ ۸)

ترکوں سے وابستگی کی عکاسی

اخباروں میں

دُنیائے اسلام کی سیاست سے "برعظیم پاک وہند کے مسلمانوں کی دلچسپی کا آغاز کب ہوا؟ اس سوال کے جواب میں عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان میں جب ترکانِ عثمانی کو شکستیں ہوئیں تو مولانا محمد علی کے "کامریڈ" اور "ہمدرد" مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" اور مولانا ظفر علی خاں کے "زمیندار" نے مسلمانوں میں ترکوں سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا۔ اور جنگِ عظیم کے بعد تحریکِ خلافت نے دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی دلچسپی کو انتہا پر پہنچا دیا۔ الٰہ آباد کے جن دو اخباروں کا گذشتہ باب میں ذکر ہوا اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کی سیاست سے اس وقت دلچسپی پیدا ہوئی۔ جب ۱۸۷۷ء میں بلقانی ریاستوں میں ترکوں کے خلاف بغاوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روس نے دولتِ عثمانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس زمانے میں سارے برِعظیم کے مسلمان اخباروں میں جنگ

کے حالات اس انداز میں چھپتے رہے جس سے ترکوں سے ہمدردی واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اُنھوں نے اداریئے لکھے جن میں انگلستان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ترکوں کی حمایت میں روس سے برسرِ جنگ ہو جائے۔ اس سلسلے میں برِّ عظیم سے ایک رضاکار فوج بھیجنے کا چرچا ہوا۔ اور ترکوں کے لئے چندہ جمع کر کے بھیجا گیا۔ غرض تقریباً وہی کچھ ہوا جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۴ء تک مسلمانانِ ہند نے ذرا زیادہ منظم طریقے پہ کیا تھا۔ اور یہ ہمدردی صرف یک طرفہ نہیں تھی۔ ترکیہ میں بھی مسلمانانِ ہند کی بہت تعریف کی گئی۔ مدراس کے ایک مسلمان ایڈیٹر کو تمغۂ مجیدیہ عطا کیا گیا۔ اور قسطنطنیہ سے اردو زبان میں ایک اخبار جاری کیا گیا۔

۱۱؍ اکتوبر ۱۸۷۷ء کے "قیصر الاخبار" میں "لارنس گزٹ" سے ایک شذرہ نقل کیا گیا۔ اس میں بتایا گیا کہ ابھی ہندوستان میں ترک مجروحین اور یتامٰے کے لئے مختلف مقامات پر چندہ جمع ہو رہا ہے۔ کہ ترکوں نے ہندوستان کے قحط کی خبر سُن کر یہاں کے لوگوں کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے اور اس وقت تک پچیس ہزار سکۂ فرانس جمع ہو چکے ہیں۔ "لارنس گزٹ" نے لکھا۔

"یہ امر روم (ترکیہ) کی عالی ہمتی میں داخل ہے۔ چونکہ حال کی بارش سے قحط کا رفع ہونا پایا جاتا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ وہ چندہ بھی ہند کی طرف سے مجروحان روم کو دیا جائے (صفحہ)

چندہ جمع کرنے اور بھیجنے کا انتظام یہ تھا:

غریب ترکوں کے واسطے چندہ

یہ پاک بنیاد ثواب افزا چندہ حضرات ذیل کی معرفت

دار الخلافت حضرت سلطانِ ترکی میں جاتا ہے۔
جناب حسین آفندی کانسل بمبئی۔ منجانب دولتِ باسعادتِ عثمانیہ۔ دوسرے سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی۔ سیکرٹری کمیٹی چندہ۔ یہ صاحب کمیٹی اسٹفورڈ ہاؤس لندن کے معرفت چندہ روانہ کرتے ہیں۔ جناب مولوی عبداللطیف خاں صاحب بہادر مجسٹریٹ کلکتہ۔ سیکرٹری چندہ۔ یہ حضرت خاص وزیر اعظم حضرت سلطان المعظم کے پاس چندہ روانہ کرتے ہیں۔ فقط

(قیصر الاخبار ہند۔ ۸ ار نومبر ۱۸۷۷ء صفحہ ۱۲)

مسلمانانِ ہند کی بھیجی ہوئی رقوم کے سلسلے میں ۱۳ ار جنوری ۱۸۷۸ء کے "احسن الاخبار" سے یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

مقدار چندہ ترک

عربی اخبار الجوائب قسطنطنیہ کا تحریر کرتا ہے کہ واسطے ترک زخمیوں کے جو چندہ ہندوستان میں جمع ہوا۔ اس کی مقدار ستاون ہزار پاؤنڈ یعنی پانچ لاکھ ستر ہزار روپیہ ہے۔

شریف مکہ

اخبار دیینے ٹی فیئر تحریر کرتا ہے کہ برادر شریف مکہ کہ جو آج کل قسطنطنیہ میں تھے۔ ان کو خفیہ پیام واسطے مسلمانانِ ہندوستان کے دیا گیا ہے۔ اور وہ روانہ ہوئے ہیں۔

ہندوستان کا سکہ پلونا میں

جب روسیوں نے پلونا فتح کیا۔ تو قیدیوں کے پاس ان کو

لوٹ میں روپے ملے۔ یہ وہ روپے تھے۔ جو مسلمانانِ ہندوستان نے واسطے امداد اپنے ہم مذہب مسلمانانِ ترکی کے لئے دیئے تھے۔ (صفحہ ۳)

۲۴ر فروری کے "احسن الاخبار" میں بتایا گیا ہے۔ کہ حکومتِ ترکیہ نے ہندوستان سے آئے ہوئے چندے میں کو دس ہزار روپیہ غازی عثمان پاشا کو دیا" اس پر غازی عثمان پاشا دیر تک ہندوستانیوں کی ہمدردی اور جوشِ قومی کا ذکر کرتے رہے۔ اس وقت دو چار روسی بھی وہاں موجود تھے۔ اور انگریزوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ وہ خیال کر رہے تھے کہ انگریز سب مسلمانوں میں اور ہم میں دشمنی اور عداوت بڑھا رہے ہیں" (صفحہ ۷)

۱۰ر مارچ کے پرچے میں یہ خبر دی گئی کہ سلطانِ ترکی نے مولوی عبد اللطیف خان بہادر کو تیسرے درجے کا مجیدی تمغہ عطا فرمایا ہے اور موصوف نے حکومتِ ہند سے اجازت طلب کی ہے۔ کہ انھیں تمغہ پہننے دیا جائے۔ اسی خبر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانانِ ہند میں چندہ کی تحریک کا آغاز ۵ر اکتوبر ۱۸۷۶ء کو ہوا۔ اس دن مولوی عبد اللطیف کی تجویز پر ٹاؤن ہال کلکتہ میں مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا اور وہاں چندہ جمع کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اسی اخبار سے یہ معلوم ہوا کہ الٰہ آباد میں انجمن اسلامیہ چندہ جمع کرتی تھی۔

جب ترکیہ کو روس کے مقابلے پر شکست ہوئی تو قسطنطنیہ کے بعض اخباروں نے اس کی ذمہ داری چند ترک افسروں کی نالائقی پر ڈالی۔ اُدھر خبر آئی کہ شام میں ایک ترک افسر نے عربوں پر زیادتی کی

نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں نے بغاوت کر دی " احسن الاخبار" نے یہ خبر دیتے ہوئے لکھا :

"پس ہم سمجھتے ہیں کہ ترک افسر اگر ایسے نالائق ہیں کہ عیسائیوں کے علاوہ مسلمان بھی اُن سے بغاوت اور سرکشی کا موقعہ پاتے ہیں تو ہمدردئ اہلِ ہند کی سب کارروائی فضول ہے ۔"

(۲۴ر مارچ صفحہ ۳)

ترکیہ اور روس کی جنگ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ برعظیم کے مسلمانوں کو روس سے بے حد نفرت ہو گئی۔ اسی نفرت کی بناء پر انھوں نے اس امر پر آمادگی کا اظہار کیا کہ اگر انگریز روس کے خلاف برسرپیکار ہو جائیں تو وہ بھرتی میں مدد دیں " احسن الاخبار" نے ۱۴ر اپریل ۱۸۷۸ء کے شمارے میں یہ خبر چھاپی کہ لکھنؤ کی ایک ہندوستانی رجمنٹ، جس میں زیادہ تر پٹھان بھرتی ہیں، جنگِ روس میں والنٹیر کے طور پر لڑنے کو تیار ہے ۔ اور دوسری رجمنٹیں بھی اس کے ساتھ ہیں۔ اسی شمارے میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ تمام دیسی ریاستوں سے فوج کا ایک ایک دستہ طلب کیا جائے۔ اور ان سب دستوں پر مشتمل فوج روس کے محاذ پر بھیجی جائے

اسی اخبار نے ۱۳ر مارچ ۱۸۷۸ء کے شمارے میں یہ تجویز بھی پیش کی۔

" اگر لڑائی ہوئی تو ہمارے پاس اور بھی بہت فوج ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہم گروہ کے گروہ عمدہ مسلح ترک، جو کہ نوکری سے چھڑا دیئے گئے ہیں، اور روٹی کی تلاش میں پھر رہے ہیں اور جن کو صرف ہتھیار، خوراک اور پوشاک درکار ہے۔ اور جو کہ روس کو ہٹانے کے لئے نہایت خوش ہیں۔ اور وہ دنیا کی

فوجوں سے کم نہیں ہیں، چند ہی مہینے میں لاکھوں آدمی بھرتی اور لڑائی کے لیے تیار کر سکتے ہیں۔ اور قریب دو لاکھ آدمی جہازوں پہ بھیج سکتے ہیں۔ جو کہ دور ہی سے دشمن پہ حملہ کریں گے اور اس طرح انگلینڈ بھی جنگی طاقتوں میں اوّل درجے کی ہو جائے گی"

(صفحہ ۲)

قسطنطنیہ کے اخبار "دار الخلافت" نے ایک مقالے میں لکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پہلے سلطنتِ عثمانیہ کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل تھیں لیکن جب سے وہاں اخبار چھپنے شروع ہوئے ہیں۔ وہ ترکوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ واقف ہو رہے ہیں۔ اور آج کل تو ترکوں سے اتنی ہمدردی کر رہے ہیں کہ ترکوں کو اس پہ یقین نہیں آتا۔ اس پر "احسن الاخبار" نے یوں تبصرہ کیا:

"سچ تو یہ ہے کہ ترکوں کی ہمدردی کا اثر دو سال سے جو ہندوستانیوں میں پڑا۔ خود ہندوستانی اس کی کیفیت اور اس کے منشا رکے دریافت کرنے میں متحیر ہیں ۔۔ اگر ہم مشرّح اپنے ایک خیال کو بھی بیان کریں تو ایک کتاب ہو جائے۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ ان دنوں ہر ہندوستانی ایک مسلح ترک ہے

(۱۳ ارجنوری ۷۸ء، صفحہ ۵)

قسطنطنیہ کے ایک اور اخبار "شہاب" نے اُس "اعانتِ وافرہ" کا شکریہ ادا کیا، جو برّعظیم کے مسلمانوں نے بھیجی۔ اور لکھا کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے تو برّعظیم سے ترکوں کے کچھ مراسم قائم تھے لیکن جب انگریز قابض ہو گئے تو وہاں کے مسلمانوں سے ہمارا کوئی "واسطۂ ظاہر"

نہ رہا تھا۔ اب یہ واسطہ "خدا کے فضل سے پھر قائم ہوا ہے۔ جس کے عمدہ اور فائدہ مند نتیجہ کی ہم کو امید ہے" (۲۷؍فروری ۱۸۷۷ء) اس سلسلے میں ایک دلچسپ خبر بہار کے کسی اخبار کے حوالے سے "احسن الاخبار" میں چھپی کہ بہار کے مسلمان ترکوں جیسا لباس پہنتے ہیں۔ اور ان کے طور طریقوں کی نقل بھی کر رہے ہیں۔ ترکوں سے مسلمانوں کی دلچسپی کی ایک اور مثال یہ ہے کہ "احسن الاخبار" اور "قیصر الاخبار ہند" کے سارے مواد کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غالب حصّہ ترکوں کے بارے میں خبروں اور مضامین پر مشتمل ہوتا تھا۔ باقی صفحات میں دوسرے اسلامی ممالک کی خبروں کو فوقیت حاصل تھی۔ یورپی خبریں بھی کثرت سے چھپتی تھیں۔ لیکن زیادہ تر وہ جن کا تعلق کسی یورپی ملک کے کسی اسلامی ملک کے ساتھ مراسم سے ہوتا تھا۔ جب ترکیہ اور روس کے درمیان جنگ کی خبروں کی مانگ بڑھ گئی تو "قیصر الاخبار" نے ۱۱؍نومبر ۷۷ء کو ایک روزانہ ایڈیشن بھی جاری کر دیا۔ جو چند ماہ بعد بند ہوگیا۔

قسطنطنیہ سے اردو اخبار

اس زمانے میں قسطنطنیہ سے شائع ہونے والے عربی اخبارات برِعظیم میں آتے تھے جن میں "الجوائب" اور "دار الخلافت" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ برعظیم کے اردو اخبار ترکیہ کی خبریں زیادہ تر انہی سے اخذ کرتے تھے۔ "قیصر الاخبار" کے ۷؍جولائی ۱۸۷۷ء کے شمارے میں بتایا گیا کہ "دار الخلافت" کے مالک اور مدیر مہران آفندی

اور اسکندر آفندی نے قسطنطنیہ سے " ترجمانِ مشرق " کے نام سے ایک اردو اخبار بھی جاری کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند سے راہ و رسم بڑھائی جائے اور یورپی پروپیگنڈے کا اثر زائل کرنے کے لئے برِّ عظیم کے مسلمانوں کو سلطنتِ عثمانیہ کی خبریں براہ راست مہیا کی جائیں۔ " قیصر الاخبار " نے اپنے قارئین سے پُرزور اپیل کی کہ وہ " ترجمانِ مشرق " کے خریدار بن جائیں۔

قسطنطنیہ کے بعض اخباروں نے ایسے مضامین چھاپے جن میں برِ عظیم کے مسلمانوں سے ترکوں کے تعلقات کی پُرانی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی۔ " قیصر الاخبار " نے ۲۴ فروری ۱۸۷۰ء کے شمارے میں اخبار " شہنباء " سے ایک مضمون نقل کیا جس میں بتایا گیا کہ سلطان سلیمان مرحوم کے زمانے میں مالابار پر مجوسیوں نے بار بار حملے کئے۔ اس پر مالابار کے نواب نے ایک سفیر بابِ عالی میں بھیجا۔ اور بابِ عالی نے فوراً امداد بھیجی۔ دو بڑے جہازوں میں شاہی یعنی جبری فوج بھیجی گئی۔ جس کی کمان یوسف پاشا اور حسین پاشا کے ہاتھ میں تھی " اس فوج نے قوم مجوس کو مغلوب و مقہور کیا۔ اور حکومتِ ملیبار بدستور ممالکِ مذکورہ پر قابض و مسلط رہی۔ ۱۱۹۰ ہجری میں قوم مجوس نے پھر حملہ کیا اور نواب نے مالی امداد مانگی۔ اس وقت سلطنتِ عثمانیہ خود آسٹریا سے برسرِ جنگ تھی۔ اس لئے تھوڑی سی نقد امداد بھیجی گئی۔ اور ساتھ ہی انگریزوں کو متنبہ کیا گیا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔ ۱۱۹۷ ہجری میں سلطان ٹیپو نے امداد کے لئے سفیر بھیجا لیکن بابِ عالی خود جنگ میں مصروف ہونے کی وجہ سے مدد نہ دے سکا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان نے سلطان عبد الحمید اول

کے زمانے میں ترکیہ کو بہت بڑی رقوم بھیجی تھیں۔ اور اس کے بعد تجویز پیش کی تھی کہ بصرہ اُس کے حوالے کر دیا جائے۔ اور اس کے بدلے سلطنتِ عثمانیہ منگلور کی زرخیز مملکت لے لے۔ سلطان ٹیپو اور بابِ عالی میں ایک معاہدہ ہوا تھا۔ لیکن اس پر عمل درآمد سے پہلے ہی انگریزوں نے اس ملک میں اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ اور سلسلۂ اتحاد مابین اہلِ ترک اور اہلِ ہند کے منقطع ہو گیا۔" اور تھوڑے عرصہ کے اندر اندر انگریزوں نے برِعظیم کے غالب حصے پر تسلّط جما لیا۔ مضمون کے آخر میں یہ سطور درج تھیں۔

"اب کہ بابِ عالی چند در چند آفتوں میں
مبتلا ہے۔ اور اہلِ ہند کی ہمدردی کی آواز اس
کے کان میں پے در پے آ رہی ہے۔ اس سے سلسلۂ
اتحاد کو از سرِ نو سرسبزی ہو رہی ہے۔"

شررؔ کا صحافتی کارنامہ

ہفت روزہ "مہذب"

اردو ادب میں مولانا عبدالحلیم شررؔ کا ایک خاص مقام ہے ان کے مضامین موضوعات کی بوقلمونی اور اسلوبِ بیان کی دلکشی اور سلاستِ زبان کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہیں۔ اور اُن کے تاریخی ناول تو آج بھی ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ شررؔ کی ادبی زندگی کا ایک اور پہلو اُن کی صحافت ہے۔ جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے ان کا ماہ نامہ "دلگداز" ایک ادبی رسالہ تھا۔ شررؔ کے اپنے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ خود اُن کے اپنے قول کے مطابق دلگداز "چلتا ہوا جادو، دردمند اور ہمدرد دلوں پر اثر کرنے والے تیروں کا ترکش" تھا۔ جس میں اُن کا ایک ناول بھی بالاقساط چھپتا تھا۔ جس کے ذریعہ سے "اسلام کی وقعت اور ہیبت کی سچی تاریخی تصویر" دکھائی جاتی تھی۔

ماہ نامہ "دلگداز" کا ذکر تو ادب کی تاریخ میں نظر آجاتا ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ ان کے اصلی صحافتی شاہکار "مہذب"

کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ پچھلی صدی کے اواخر میں نکلنے والے ہفت روزہ جرائد میں "مہذب" ایک نمایاں حیثیت کا مالک تھا۔ اس اخبار کا پہلا فائل میرے نجی کتب خانے میں موجود ہے "مہذب" یکم اگست ۱۸۹۰ء کو منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ وجہ تسمیہ ملاحظہ ہو:-

"مہذب اپنے نام کے مطابق اپنے اغراض کو نہایت تہذیب کے ساتھ پورا کرے گا۔ قدیم شرفاء کا برتاؤ جس متانت کا نمونہ ہوتا تھا۔ اس کو ہمارے ہم وطن مہذب کے صفحوں اور اس کی رفتارِ اشاعت سے نمایاں پائیں گے شریفوں کی یہ رفتار کہ اپنی عزت کو ہمیشہ سنبھالتے رہیں اور کوئی آوارہ گرد بدمعاش ان پر ہزار حملہ کرے مگر وہ اسے خوبصورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ٹال دیا کرتے ہیں۔ وہی رفتار مہذب کا دستور العمل ہوگی۔"

پہلے شمارے میں پالیسی ان الفاظ میں واضح کی گئی:-

"تین ہی اصول ہیں جن پر عام اخبارات کی تحریروں کا مدار ہے پالیٹکس، سوسائٹی اور لٹریچر۔ مہذب بھی ان تینوں معاملات میں اپنے ناظرین سے پوری ترقی اور کامیابی کا وعدہ کرتا ہے۔ پالیٹکس کی حیثیت سے وہ اوّل درجہ کا آزاد ہوگا۔ نہ گورنمنٹ کی دوستی میں ملک کے ساتھ دشمنی سمجھے گا۔ اور نہ اہلِ ملک کی دوستی میں گورنمنٹ کا دشمن بن جائے گا۔ دیسی ریاستیں مہذب کو اپنا بہت بڑا خیر اندیش

اور دوست پائیں گی۔ سوشل یعنی اخلاقی معاملات میں مہذب رہنمائے ملک بن کے ایک نہایت ہی مہربان اتالیق کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور اخلاقی دنیا میں موجودہ ریفارمروں کے ہل چل ڈال دینے سے جو زلزلے اور طوفان بپا رہا کرتے ہیں۔ ان کو بھی یہ اخبار دفع کرے گا۔ باقی رہا لٹریچر۔ اس حیثیت سے مہذب کے چاہے، کتنے وعدے ہوں۔ ملک سب کو تسلیم کرے گا۔ کیونکہ جن ہاتھوں میں دلگداز ہے انہی ہاتھوں میں یہ اخبار بھی ہے۔ دلگداز اس کا بھی ثبوت دے چکا ہے۔ کہ جو شخص مہذب کا ایڈیٹر ہے۔ اس کو تاریخ کا پورا ذوق ہے اور بہت عمدہ عمدہ تاریخی مضامین دلگداز کے ذریعہ سے ملک کے سامنے پیش کر چکا ہے۔ لہذا اگر کسی اخبار کو تاریخی حیثیت سے عمدہ ہونے کی امید ہو سکتی ہے تو وہ مہذب ہی ہے۔"

"مہذب" کا ہر شمارہ جہازی تقطیع کے بارہ صفحات پر مشتمل ہی۔ پہلے صفحے پر نام کی پٹی کے بعد مختصر شذرات درج ہیں ایک گوشے میں فہرست مضامین دی ہوئی ہے۔ پہلے شمارے میں مہذب کے عنوان سے اس پرچے کی شانِ نزول بیان کی گئی ہے۔ جس سے مندرجہ بالا اقتباسات لئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہگلی کے ہندو مسلم فساد اور اسلام اور پردہ کے عنوان سے دو مضمون درج ہیں۔ پھر ابو اسحاق شیرازی کے حالاتِ زندگی کی پہلی قسط درج ہے۔ اور بعد میں مراسلات اس نوٹ کے ساتھ کہ "کچھ ضرورت نہیں کہ ایڈیٹر کو بھی ان راؤں سے اتفاق ہو" اس کے بعد خبریں درج ہیں جو زیادہ تر غیر ممالک کی ہیں۔ آخر میں "لوکل" کے عنوان سے لکھنؤ کی [illegible]

خبریں اور موسم کا حال بیان کیا گیا ہے۔ آخری صفحے پر اشتہار ہیں۔

مولانا عبدالحلیم شرؔر سر سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے حامی نہیں تھے۔ لیکن ملکی سیاست کے بارے میں اُن کی پالیسی یہی تھی کہ مسلمانوں کو کانگرس سے الگ تھلگ رکھا جائے۔ حکومت کی خیر خواہی کا دم بھرا جائے۔ اور دیسی ریاستوں کے بارے میں ذرا کھُل کر لکھا جائے۔ ہندو مسلم چپقلش کے بارے میں اُنھوں نے جو شذرے وقتاً فوقتاً لکھے اُن سے اُس زمانے کی سیاست کا یہ پہلو قدرے اُجاگر ہوتا ہے اور برِ عظیم کی اسلامی سیاست کے طالب علم پر یہ انکشاف بھی ہوتا ہے۔ کہ دو قومی نظریہ کسی ایک شخص یا ایک جماعت کی ایجاد نہیں تھا۔ بلکہ ایک شذرے سے تو پاکستان کے تصوّر کی بھی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان شذرات کا مختصر سا جائزہ لیا جائے۔

پہلے شمارے کے ایک شذرے میں بتایا گیا ہے کہ امام باڑہ ہگلی کے پاس ایک بنگالی بابو مسلمانوں کو محض چھیڑنے اور اشتعال دلانے کی غرض سے سنکھ اور گھنٹے بجا کر ان کی اسلامی عبادت کی توہین کرتے ہیں۔ اس قسم کے اشتعال سے فساد ہو جاتے ہیں۔ پھر حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس اشتعال کو فرو کرے "ورنہ یہ اشتعال بڑھتے بڑھتے تمام بنگال میں اور پھر تمام بلادِ ہند میں پھیل جائے گا"۔

۱۵ اگست ۱۹۰۰ء کے شمارے میں آریہ سماج سبھا کی خدمت میں گذارش کی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں سے لڑائی نہ مول لے۔ ۲۳ اگست ۱۹۰۰ء کے شمارے میں عید الضحیٰ کے موقعہ پر فسادات کا ذکر کرتے ہوئے یہ نتیجہ

نکالا گیا ہے۔ کہ جو لوگ یہاں کی قوموں کو ایک بتاتے ہیں۔ وہ سخت غلطی پر ہیں"۔ بعض مقامات پر ہندوؤں نے مسلمانوں کا معاشی مقاطعہ کیا۔ اس کے جواب میں شرؔر رقمطراز ہیں:

"ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آگیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین و دلشکنی کئے نہیں پوری ہوتیں اور نہ اتنا صبر و تحمّل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کو طرح دے۔ تو ہندوستان کے اضلاع کو ہندو مسلمان باہم تقسیم کر لیں اور اپنی آبادی علٰحدہ کر لیں"۔

یکم ستمبر کے پرچے میں لاہور کے انگریزی اخبار "ٹریبیون" کے اس اقتباس پر توجہ دلائی گئی ہے کہ "جگادھری کے بازاروں میں علانیہ گائے کا گوشت بکتا ہے۔ ہندو باوجود کثرت کے کیوں ساکت ہیں"۔ یکم نومبر کے پرچے میں "ہندو مسلمان" کے عنوان سے ایک اور مضمون درج ہے۔ جس میں متحدہ قومیت کے تخیل کو ان الفاظ میں ناممکن بتایا گیا ہے۔

"ہندوستان کی پولٹیکل قوت کا دار و مدار بالکل ان دونوں مذکورہ قوموں کے اتفاق پر ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس وقت تک متواتر کوششیں کی گئیں کہ دونوں فریقوں میں ایک مضبوط اور ضروری نیشنلیٹی پیدا ہو۔ لیکن تجربہ روز بروز بتاتا جاتا ہے کہ وہ سب کوششیں خاک میں مل گئیں۔ اور کوئی نتیجہ نہیں پیدا ہوا"۔

اسی مضمون میں لکھا ہے کہ جب سے کانگرس کا وجود عمل میں آیا ہے ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے ہیں۔ کانگرس کے بارے میں عام تصور یہی ہے کہ یہ مدتوں انگریزوں کی سرپرستی کے طفیل چلتی رہی۔ اور حکمران طبقہ اس کا

ہمدرد تھا۔ لیکن "مہذب" کے ۲۳ر اگست ۱۹۰ء کے شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں حکمران طبقہ اس کا بے حد مخالف تھا۔ راجپوتانہ کی ریاستوں کے پولٹیکل ایجنٹ مسٹر ہنری کے دو سرکلر چھاپے گئے ہیں۔ جن میں تمام ریاستی حکمرانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی حدود کے اندر کانگرس کے جلسوں کی امداد نہ کریں۔ اور اگر کانگرس کا کوئی ایجنٹ ریاست میں داخل ہو تو اُسے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر نکال دیا جائے۔ کوئی خبر کسی ریاست کے متعلق کسی اخبار میں نہ بھیجنی چاہیئے ..." جب کسی ایڈیٹر اخبار یا کسی اور شخص سے ملاقات ہو۔ تو ہندوستانی رؤسا کو اپنی ریاست کے حالات نہ بتلانا چاہئیں۔" ریاستی حکمرانوں سے کہا گیا کہ وہ "امرت بازار پتر کا" کی خریداری بند کر دیں اگر کوئی شخص یہ اخبار پڑھتا ہو، یا اس کی نامہ نگاری کرتا ہو۔ تو اس کی اطلاع ریذیڈنٹ کو دی جائے۔ اور بنگالیوں پر کڑی نگرانی رکھی جائے بلکہ انھیں کوئی ملازمت بھی نہ دی جائے۔ ان احکام پر تبصرہ کرتے ہوئے "مہذب" لکھتا ہے:

"ان سرکلروں کے ذریعہ سے مسٹر ہنری نے گورنمنٹ کی الفاف پسند پالیسی پر بہت بڑا دھبہ لگا دیا۔ گویا ہندوستانی رؤسا بالکل غیر قابلِ اعتبار اور بنگالی بالکل باغی تصوّر کر لئے گئے۔ یہ بہت آسان ہے کہ کسی فریق کو باغی قرار دے دیا جائے۔ مگر اس کا ثبوت دینا بہت مشکل ہے۔ کانگرس کی عام کارروائیوں کو کوئی باغیانہ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اس کے بعض رزولیوشن ایسے ہیں جو مسلمانوں کے قومی اغراض کے سخت مخالف ہیں۔ اور اس وجہ سے مسلمانوں کو اس

سے اختلاف ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ لوگ گورنمنٹ کے دشمن ہیں"

بعض مضامین سے اس زمانے کی صحافت کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ۸ر اکتوبر کے شمارے میں "ہندوستانی خریداران اخبار" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون میں بتایا گیا ہے کہ شاذ ونادر ہی کوئی ایسا ایڈیٹر ہوگا۔ جسے اخبار نویسی کے اُصول سے واقفیت ہو" زیادہ تر اخبار اُن لوگوں نے نکال رکھے ہیں جو کثیر الاحباب ہیں۔ انھوں نے اخبار کو چندہ بٹورنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ ان کے اخبار عام طور پر بند ہی پڑے رہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اپنی کسی قسم کی تجارت کے اشتہار چھاپنے کے لئے اخبار جاری کر رکھے ہیں۔ انھیں ایڈیٹروں کی ضرورتوں سے کوئی واقفیت نہیں۔ جو پرچے تبادلے میں آتے ہیں۔ انہی سے مضمون کاٹ چھانٹ کر چھاپ دیتے ہیں۔ صرف چند اخبار ملک میں نظر آتے ہیں جو لائق لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اور کسی نہ کسی قدر اپنے فرائضِ منصبی کو پورا کرتے ہیں۔ مگر اس خیال کے لوگ آزاد مشرب ہوتے ہیں۔ جو نہ تو یہ پسند کرتے ہیں کہ بے درخواست آئے کسی کے نام پرچہ جاری کر دیا جائے۔ نہ مروت کا دباؤ ڈال کر اپنا اخبار کسی کے گلے منڈھنا جائز رکھتے ہیں" نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خریداروں کی تعداد محدود ہوتی تھی اور ان میں بھی اکثر چندے کی ادائی میں بخل روا رکھتے تھے۔ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں اخبارات کے بارے میں لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ ان میں سچی بات لکھی ہی نہیں جاتی۔

۸ر دسمبر کے شمارے میں فنِ تنقید پر ایک مقالے کی پہلی قسط چھاپی گئی۔ برسبیلِ تذکرہ عرض ہے کہ Criticism کا ترجمہ "نکتہ چینی" کیا گیا ہے۔ اس سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہمارے ہاں اس وقت تک اس فنِ شریف کی طرف ابھی توجہ نہیں ہوئی ہے۔ کوئی خاص رسالہ اس قسم کا اردو میں نہیں نکلتا جس میں بے غرضانہ، بلالوث، اور بے تعصبی سے کام لیا جاتا ہو۔ یہ کام اس وقت تک اخبار نویسوں کے ہاتھ میں ہے۔ جن میں سے اکثر کم علم ہیں یا جہل مرکب میں مبتلا۔ ان کے نزدیک اس فن کی وقعت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اگر کسی دوست کی کتاب ہے تو حقِ دوستی ادا کرنا۔ اور اگر کسی ایسے شخص کی ہے جس سے ایڈیٹر بوجہ یا بلا وجہ ناخوش ہے تو منصبِ دشمنی پورا کرنا۔ اور اگر کسی امیر کی کتاب ہے تو دو چار صفحوں سے دس بیس غلطیاں واقعی یا بنائی ہوئی نکالنا اور مصنف کو آئندہ نمبروں میں زیادہ سخت لکھنے سے ڈرا کر کچھ وصول کر لینا اور چپ ہو کر بیٹھے رہنا۔ یا نوجوان ہیں۔ ناتجربہ کار اور تعصب سے بھرے ہوئے۔ کبھی کوئی کتاب اپنی لکھی نہیں۔ اور دوسروں کی غلطیاں نکالنا اپنا پیشہ قرار دے لیا۔ اور اس عیب جوئی کا نام نکتہ چینی رکھ دیا۔"

اُس زمانے میں اخبار نویس لوگ ریاستوں سے عموماً روپیہ بٹورا کرتے تھے۔ اور اُن کی دیکھا دیکھی بعض غیر اخبار نویس لوگ اپنے آپ کو اخبار نویس ظاہر کر کے ریاستوں میں مفت کی دعوتیں اڑا لیتے تھے۔ اس سلسلے میں شرر کا یہ ادارتی شذرہ پڑھنے کے قابل ہے۔

"بقول ہم عصر ہندوستانی کے بعض لوگوں نے یہ کمینہ خصلت اختیار کر لی ہے کہ ریاستوں میں جاتے ہیں اور رقمیں وصول کرتے ہیں۔ ہم کو اس سے بھی زیادہ تجربہ ہو چکا ہے کہ بعض حضرات اپنے آپ کو کسی اخبار کا ایڈیٹر مشہور کر کے مفت کی دعوتیں اُڑاتے ہیں۔ بلکہ اخبار کی قیمت بھی ایک آدھ صاحب نے وصول کر لی۔"

بعض معاشرتی مسائل پر بھی مواد ملتا ہے۔ جو چند پرچے میرے پیش نظر ہیں۔ ان میں پردے کے مسئلے پر بڑے زور شور سے لکھا گیا ہے۔ یہ معاملہ یوں شروع ہوا کہ حیدر آباد دکن میں کسی غریب نے کہہ دیا کہ عورتوں کو تعلیم دلانے کے لئے ضروری ہے کہ برقعے سے کنارہ کشی کی جائے۔ اس پر مولانا شررؔ کا قلم حرکت میں آیا اور اُس نے پہلے ہلّے میں سر سید احمد خاں کو لپیٹ میں لے لیا۔ فرمانے لگے۔

"افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اخلاقی ریفارمر جناب سر سید احمد خاں بہادر کی تحقیق کے مطابق پردہ شاید صرف ستر عورت کا نام ہے۔ کیونکہ اُن کے اس آخر زمانے کے اجتہاد میں منہ اور ہاتھ پردے میں شامل نہیں ہیں۔ مگر میں کیا کروں کہ عام مسلمانوں کی طرح میرا خیال بھی اس کی تقلید سے انکار کرتا ہے۔"

"سرمور گزٹ" کے مدیر منشی محمد سراج الدین صاحب نے جھٹ سر سیّد کے نام خط لکھ کر شررؔ کے الزام کا جواب مانگا اس پر سر سیّد نے یہ چٹھی لکھی۔

"مخدومی۔ بے شک میں پردے کا متعدد وجوہ سے نہایت طرف دار ہوں۔ اور بالتخصیص ہندوستان میں۔ اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے۔ نہ میں نے کبھی اس پر غور کیا۔ مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہونچے تک اور پاؤں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں۔ فقہائے متاخرین نے بسبب فسادات زمانہ مُنہ کو پردے میں داخل کیا ہے۔ مولوی شرر نے ایک لغو بات میری نسبت لکھ دی۔ شاید میں نے کسی کے سامنے کہا ہو گا کہ شرعاً منہ اور ہاتھ پردے میں داخل نہیں ہیں ان کو چاہیئے کہ خود فقہ کی کتابیں دیکھیں۔ والسلام

علی گڑھ خاکسار سید احمد

۱۷ اگست ۹۰ء

اس کے جواب میں شرر نے پہلے تو اطمینان کا اظہار کیا کہ سید صاحب کے بارے میں جو خیالات تھے وہ غلط ثابت ہوئے پھر لکھا:

"مگر ہاں گفتگو اس میں ہے کہ ہم نے لغو بات کہی۔ بے شک سید صاحب ایسے بزرگ کے سامنے ہماری سب باتیں لغو ہیں۔ مگر ایسی لغو ہیں کہ سید صاحب خود اعتراف کر رہے ہیں کہ شاید میں نے کسی کے سامنے کہا ہو گا۔"

شبلی سے شرر کے تعلقات میں نشیب و فراز آتے رہے۔ مہذب کے صفحات پر کبھی تو "حضرتِ شبلی نعمانی" کا ذکر ہوتا ہے اور کبھی "مولوی شبلی صاحب" کا۔ شرر نے امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ کے سوانح شائع کیے۔ شبلی نے ذرا سخت الفاظ میں اختلافی مکتوب لکھا۔ شرر نے اسے

"داخل دفتر کر کے شبلی کو ہدفِ مطاعن بنایا۔ فرمانے لگے:

" واقعی مولوی شبلی صاحب شاید دنیا بھر میں فنِ تاریخ میں کسی کو اپنا نظیر نہ پاتے ہوں گے۔ ہماری کیا ہستی ہے۔"

شرر نے شبلی کو مشورہ دیا کہ وہ انھیں "مہذب" کے صفحات پر گالیاں دینے کا شوق نہ فرمائیں۔ اس مقصد کے لئے کسی اور اخبار کو منتخب کریں اور:

" انھیں ہم ابھی سے اطمینان دلائے دیتے ہیں کہ ہم متوجہ نہ ہوں گے۔ یہ ہم کو اسی روز معلوم ہو گیا تھا۔ جس روز ہم نے سید صاحب سے مخالفت کی تھی۔ رہا یہ کہ ہم نے کسی خاص کتاب سے ترجمہ کر دیا۔ اس کو ہم بالکل تسلیم نہیں کر سکتے اور شاید معترضوں کا دامن بھی اس سے پاک نہ ہوگا۔"

اگر مولانا شرر اس آخری فقرے کی وضاحت فرما دیتے۔ تو یہ بھی ایک بڑی علمی خدمت ہوتی۔

"مہذب" میں علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور دینی غرض ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے۔ کتابت اور طباعت عمدہ تھی اور سارا پرچہ پڑھنے کے قابل ہوتا تھا۔ افسوس، مجھے صرف پانچ چھ ماہ کا نامکمل سا فائل ملا۔ ورنہ شاید یہ مضمون زیادہ جامع بنایا جا سکتا۔

مٹیا برج کی کہانی

"اودھ اخبار" کی زبانی

۱۸۵۶ء میں اودھ کی سلطنت کا تختہ اُلٹ گیا۔ واجد علی شاہ کا تاج و تخت چھن گیا لیکن رنگیلے پیا کی زندگی اپنی تمام رنگینیوں اور تابانیوں کے ساتھ برقرار رہی۔ فرق اتنا ہوا کہ پہلے گرمیٔ بزم کا سامان لکھنؤ میں ہوتا تھا۔ پھر مٹیا برج (کلکتہ) میں محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔ وہی کثیر التعداد حسین و جمیل بیگمات، وہی خوش ادا کنیزیں، وہی شاعر، میراثی، اور ڈوم ڈھاڑی، وہی مشاعرے اور ناچ اور راگ رنگ کی محفلیں، ایک ربع صدی گذر گئی۔ لیکن واجد علی شاہ کی آن بان اور ٹھاٹھ باٹ میں فرق نہ آیا۔ چونکہ لکھنؤ کے لوگوں کو اس کی سرگرمیوں میں دلچسپی تھی۔ اس لئے وہاں کے روزنامہ "اودھ اخبار" نے مٹیا برج میں ایک خاص نامہ نگار متعین کر رکھا تھا۔ جو وقتاً فوقتاً خبرنامے ارسال کرتا تھا۔ اور لکھنؤ کے لوگ ان کے مطالعہ سے لذت اندوز ہوتے تھے۔ حسنِ اتفاق سے "اودھ اخبار" کا ۱۸۸۰ء کا

ایک فائل پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اُسی سے مٹیا برُج کے خبر ناموں سے چند اقتباس درج کیے جاتے ہیں۔ ان میں کہیں تلخیص کی ہے کہیں زبان میں معمولی تبدیلی کر دی ہے۔

چڑیا خانہ

واجد علی شاہ کو طرح طرح کے جانور پالنے کا بے حد شوق تھا ہر سال مٹیا برُج میں ان کی نمائش ہوتی تھی۔ جسے ہزارہا لوگ دیکھتے تھے۔ "اودھ اخبار" کے نامہ نگار خصوصی نے ۲۶ر جنوری ۸۰ء کے شمارے میں اس کی داستان یوں قلمبند کی ہے۔

" ۹ار جنوری کو بادشاہ کے حکم کے بموجب عجیب و غریب جانوروں کے ہزارہا پنجرے کوٹھی مرصع منزل میں نہایت عمدگی سے رکھے گئے۔ اور دس بجے دن سے تماشائیوں کے آنے کا حکم ہوا۔ قریب دوپہر کے ہزارہا انگریز اور ہندوستانی اور بنگالی جمع ہو گئے۔ اور شام کے وقت مٹیا برُج میں سوائے گاڑیوں اور آدمیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ گاڑی کا کرایہ نہایت درجہ گراں ہو گیا تھا۔ بلکہ گاڑیاں ملتی بھی نہیں تھیں۔ مجبور ہو کر صدہا آدمی کشتیوں پر آئے۔ دنیا کے ہر مقام کے آدمی، جو کلکتہ میں ہیں وہ اس چڑیا خانے کو دیکھنے آئے تھے۔ چڑیا خانے میں جس جانب طوطوں کے پنجرے رکھے تھے۔ اس میں زرد اور سفید اور سرخ اور سبز اور مختلف رنگوں کے طوطے بیٹھے بول رہے تھے۔ ایک جانب دنیا کے ہر قسم کے بندر تھے جن کے دیکھنے سے قدرت خدا یاد آتی تھی۔ یہ انتظام بھی اچھا تھا کہ ہر ایک پنجرے پر ایک چٹھی

لکھی ہوئی تھی کہ اس ملک کا یہ جانور ہے۔ ایک طرف گلہریوں کا تماشا تھا۔ دنیا کے ہر حصے میں جس رنگ اور جس قسم کی گلہریاں ہیں وہ سب یہاں تھیں۔ بعض چھوٹی اور بعض بڑی تھیں۔ اور ان کو جو دیکھتا تھا وہ حیرت میں رہ جاتا تھا۔ ایک گورخر عجیب رنگ کا ہے اور ایک اور جانور ہے۔ جس کا جسم بہ شکلِ خچّر اور منہ اور سُم بہ شکل گاؤ۔ اور شاخِ سر مثل ہرن کے ہے اور ایک تحریر سیاہ رنگ کی سر سے دُم تک ہے۔ غرض کہ صدہا اور ہزارہا بلکہ لکھوکھا جانور عجیب و غریب اور رنگ برنگ چڑیا خانہ سلطانی میں موجود ہیں۔ جب تماشائیوں نے ہر رنگ اور ہر ملک کے شیر دیکھے تو شیروں کے اقسام اُنھیں معلوم ہوئے۔ بادشاہ سوار ہو کر اس چڑیا خانے میں آئے راہ میں شہزادہ میرزا جہاں قدر کو پاپیادہ جاتے ہوئے دیکھا۔ حکم دیا کہ ہاتھی پر سوار ہولیں۔ ہزارہا دکانداروں کی دکانیں اس میلے میں تھیں۔ بادشاہ اس انبوہ کثیر اور جمِّ غفیر کو دیکھ کر حیرت میں تھے۔ ایک روز مرقّع منزل میں شکار ہوا۔ بادشاہ سوار ہو کر اس انبوہ میں بڑی مشکل سے آئے ایک گیدڑ پر سیاہ گوش چھوڑا گیا۔ فوراً ہی یہ شکاری جانور نرم چارہ پا کر گیدڑ کا کلّہ دبا کر بیٹھ گیا۔ بعد میں مینڈھے آئے۔ تھوڑی دیر تک اس جانور نے اپنی ٹکروں کی کیفیت دکھائی۔ کتوں کا بھی تماشا ہوتا رہا۔ مگر بوجہ عدم گنجائش کے کتّوں کا شکار موقوف رہا۔ بیان ہے کہ امسال چڑیا خانے کے تماشے کے واسطے حکام بہت کم آئے۔ اس کی وجہ ایک تو منشی امیر علی کا انتقال ہے۔ اور دوسرے ٹکٹوں کی تقسیم کا انتظام اچھا نہیں تھا۔

بادشاہ نے تو یہ بھی حکم جاری کیا تھا کہ اگر معزز افسر آئیں۔ تو
انھیں باریابی کا شرف بخشا جائے گا۔"

دوسرے دن نامہ نگار بیان کرتا ہے کہ گاڑی کا کرایہ کلکتہ سے مٹیا برج تک ایک روپیہ فی گاڑی تھا۔ لیکن جس دن چڑیا خانے کا افتتاح ہوا۔ کرایہ چار روپے ہو گیا۔ جو گاڑیاں پھاٹک کے اندر آئیں اُن کی تعداد دو ہزار سات سو چھہتر تھی" یہ گاڑیاں صرف معزز صاحبانِ انگریز کی تھیں۔ باہر جو گاڑیاں تھیں ان کا کچھ شمار نہیں"

۲۶ر جنوری کے شمارے میں چڑیا خانے کی رسم افتتاح کی ایک اور داستان درج ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے۔ کہ افتتاح کے دوسرے دن ایک لاکھ تماشائی آئے۔ نامہ نگار رقمطراز ہے:۔

"مہتمم جانور خانہ حضرت کے کہتے ہیں کہ دس ہزار پانسو سینتالیس جانور ہر قسم کے سوائے کبوتران اور ماہیان کے اس تاریخ موجود تھے۔ زوولاجیکل گارڈن کا جانور خانہ جو کہ چندے سے بنایا گیا ہے شاید مجموع جانور اس میں ہر قسم کے دو ہزار بھی نہ ہوں گے اور یہ صفائی اور عمدگی مکانات کی کیفیت صافی دلانِ الفاف پسند سے پوچھنا چاہیئے۔ دیدۂ صفا میں سے دیکھنا چاہیئے۔ اس پر ہماری گورنمنٹ کو حضرت (واجد علی شاہ) کی تہی دستی پر خیال فرمانا چاہیئے جانور خانۂ شاہی پر نگاہِ کرم ہے۔ ایسی باز پرس لائق شرم ہے۔ حضرت بھی نمائشِ جانور خانہ پر اگر چندہ اور ٹکٹ مقرر فرماتے۔ لاکھ دو لاکھ روپے سالانہ جمع کرتے۔"

جانوروں کی خبریں

۹ر جنوری کے شمارے میں بتایا گیا ہے کہ واجد علی شاہ کی نگرانی میں گھوڑ دوڑ ہوئی۔ اس تقریب میں گورنر جنرل بھی تشریف فرما تھے۔ اور "سنا گیا ہے۔ کہ گورنر جنرل ایک پیالہ چاندی کا لائے تھے۔ کہ جو جیتے گا اُس کو مرحمت ہوگا۔ لیکن غالباً یہ محض شنیدہ ہی تھی"

ایک اور جگہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک گھوڑا دیوانہ ہوگیا۔ آخرالامر لوگوں نے یہ تجویز کی کہ ایک زندہ گیدڑ لاکر اُس کے سامنے چھوڑ دیا جائے۔ خیر کہیں سے ایک گیدڑ لاکر چھوڑ دیا گیا۔ گھوڑے نے اس کو کاٹا "آخرالامر گیدڑ کو گھوڑے نے مار ڈالا۔ اور شام تک گھوڑا خود بھی مرگیا۔"

مٹیا برُج کے مسائل میں سے ایک اور مسئلہ ملاحظہ ہو:

"ایک ہزار چھ سو روپے کے جو چار ٹٹّو خریدے ہوئے تھے۔ وہ اب نہایت درجہ لاغر ہوگئے ہیں۔ مٹیا برُج میں لوگ کہتے ہیں کہ اگر بادشاہ کے روبرو یہ ٹٹّو پیش ہوں۔ تو وہ ہرگز سلطانی گاڑی کے واسطے ایسے ٹٹّوؤں کو پسند نہ کریں۔ بادشاہ کو ان ٹٹّوؤں کو دیکھنا چاہیئے۔"

اسی مکتوب میں بتایا گیا ہے کہ جانوروں کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ کیونکہ ان کے لئے چارے کا درُست انتظام نہیں۔ ایک اور جگہ خبر دی گئی ہے کہ ایک شیر بھوک سے مرگیا۔

۲۱ر اپریل کے پرچے میں درج ہے کہ ایک رات بادشاہ آرام فرما رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑا ریچھ محلسرا کے کوٹھے پر

پھر رہا ہے۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھا رہا ہے۔ حکم ہوا کہ اسے گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ بڑی مشکل سے گرفتاری عمل میں لائی گئی۔

بیگمات

۲۴ر مارچ کے پرچے میں عباسی بیگم کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے نامہ نگار لکھتا ہے:

"ان کی اولاد کی پرورش، دیکھنا چاہیئے، کس طرح پر ہوتی ہے۔ ان بیگم صاحبہ کو پینتیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ انھوں نے کوئی جائیداد بھی نہیں چھوڑی ہے۔"

۲۸ر فروری کے شمارے میں ایک بیگم کے فرار کا واقعہ یوں بیان ہوا:

"ایک بیگم صاحبہ کربلائے معلّیٰ جانے کے بہانے مرشدآباد چلی آئی ہیں۔ میٹا برج میں لوگوں کا یہ قول ہے کہ جو بیگم بادشاہ سے کربلائے معلّیٰ جانے کی اجازت لیتی ہے اس کو بادشاہ اجازت دے دیتے ہیں۔ اور اگر یہ بات نہ ہو تو کیا مجال ہے کہ کوئی بیگم کہیں باہر جانے کا ارادہ کرے۔"

اشفاق السلطان بیگم پر ایک شخص نے مقدمہ چلایا۔ کہ اُس نے اُس شخص کی بیوی کو بادشاہ کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ بہر حال بیگم بَری ہو گئیں۔ لیکن انھوں نے انتقام یوں لیا کہ اُس شخص اور بادشاہ میں لڑائی کرا دی۔ گلبدن بیگم فوت ہوئیں تو بادشاہ سے عرض کیا گیا کہ گلبدن بیگم حضور پر تصدق ہوئیں۔ انھوں نے بڑا افسوس کیا اور پھر لعد کو حکم دیا کہ ریحان الدولہ سے

کہو کہ اس کی تجہیز و تکفین کربلا میں لے جا کر اچھی طرح سے کر دیں"

۲۵ر فروری کے "اودھ اخبار" سے یہ خبر ملاحظہ ہو:

"دو روز ہوئے کہ معشوق محل بیگم کی لاش کو قبر سے نکال کر ایک ٹین کے صندوق میں بند کر کے میدان میں رکھ دیا ہے اور آپس میں تقسیم ترکہ ہو رہی ہے۔ مگر کوئی پُرسانِ حال نہیں کہ واسطے دفن کے کربلائے معلیٰ روانہ کرے۔ تمام ہٹیا برج میں خصوصاً محلات میں عدم روانگیٔ لاش کا اس قدر چرچا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔"

یہ نعش تقریباً دس دن بعد دفن ہو سکی۔

پرستان کی کیفیت

"عید کے دن بادشاہ دن کے بارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک جشن کی تیاری میں رہے۔ پھر کوٹھی سلطان خانہ میں داخل ہوئے۔ قریبِ شام ایک تصویر طلب کی۔ اس میں آتش بازی لگی ہوئی تھی۔ خوب آتش بازی چھوڑا کیے۔ بہت عمدہ عمدہ آتش بازی کاریگرانِ کلکتہ کے ہاں سے تیار ہو کر آئی تھی۔ اور کاریگرانِ لکھنؤ کی علیحدہ آتش بازی تیار تھی۔ مقابلہ میں چھوڑائی گئی۔ ازاں بعد غبارے اڑائے گئے۔ پھر سب آپس میں عید ملے۔ تمام شہزادے پیازی اور عمدہ پوشاکیں پہن کر آئے تھے۔ یہ دن بادشاہ کے ہاں بڑی خوشی کا تھا۔ تمام مرد و زن رنگین پوشاکوں سے آراستہ تھے۔ پرستان کی کیفیت نظر آتی تھی۔ (۲۵ر فروری)

روحانی طاقت

۱۲ر فروری کے پرچے میں حکیم طبیب الدولہ کا ذکر کیا گیا ہے
"یہ حکیم نابینا ہیں۔ اور مشہور ہے کہ پادشاہ کی دُعا سے آٹھ دن میں ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔"

۳ر فروری کے شمارے سے یہ خبر ملاحظہ ہو:

"عرصہ دو برس کا ہوا کہ ایک خاص تراش دولہا بنا ہوا حضرتِ جم جاہ (واجد علی شاہ) کے روبرو گذرا۔ پادشاہ نے دریافت کیا کہ کیا تو نے شادی کی ہے۔ اُس نے کہا ہاں۔ ایک میدانی سے شادی کی ہے۔ اس پہ پادشاہ نے اُسے نکلوا دیا۔ اور کہا کہ تو اندھا ہو گیا۔ پس جب وہ گھر جانے لگا تو اثنائے راہ میں اندھا ہو گیا۔ اس دن سے اہلِ مٹیا بُرج پادشاہ کی بد دعا سے خوف کرتے ہیں۔ لوگوں کو اس قدر اعتقاد ہے کہ جو پادشاہ کہہ دیں وہی ہوگا۔"

۱۶ر جنوری کے پرچے میں یہ خبر درج ہے:

"داروغہ غلام عباس علی خاں سے پادشاہ نے ارشاد کیا کہ کبوتروں کی روٹیاں لاؤ۔ وہ لے کر سامنے گیا۔ دیکھ کر کہا۔ جو کوئی میری نمک حرامی کرے گا وہ اندھا کوڑھی ہو جائیگا اس پر داروغہ نے کہا۔ ہاں خداوندا! جو کوئی ایسا کرے گا اندھا ہو جائے گا۔ پادشاہ نے کہا۔ تو اندھا ہوگا۔ پس داروغہ کا خون خشک ہو گیا۔"

در مدحِ خود

محرم کی مجالس کا ذکر کرتے ہوئے ۳۱ جنوری کے پرچے میں درج ہے :

"پادشاہ نے گلشن الدولہ کو حکم دیا کہ میرا کلام منبر پر جا کر پڑھو۔ وہ پڑھتے جاتے تھے اور پادشاہ اپنے کلام کی خوبیاں بیان کر رہے تھے۔ اور ہر ایک جانب واہ واہ اور سبحان اللہ کی صدا بلند تھی۔"

میر انیس کے فرزند میر سلیس نے مجالس میں اپنا کلام سنایا تو پادشاہ نے انھیں گلابی دوشالہ عطا کیا۔ میر سلیس نے پادشاہ سے کہا مجھے شاگرد بنا لیجئے۔ وہ شیرینی بھی لائے۔ اور ایک مرثیہ اصلاح کے لئے پیش کیا۔ پادشاہ نے پانچ مقامات پر اصلاح دی، جسے میر سلیس نے بہ صد شکریہ قبول کیا۔ ایک اور مجلس میں پادشاہ نے میر سلیس سے پوچھا "میں نے تمہارے مرثیہ پر کیسی اصلاح دی؟" انھوں نے کہا۔ "حضور! بہت ہی انسب اور بہتر اصلاح ہوئی ہے۔"

رموزِ مملکت

واجد علی شاہ اپنے ایک مصاحب معتبر علی خاں سے ناراض ہو گئے کیونکہ وہ شاہی کہاری سے اپنے پاؤں دبوا رہے تھے۔ ۲۰ فروری کے شمارے میں درج ہے۔

"پادشاہ کے ہاں نوکروں کو قیام نہیں یہاں ذرا سی بات میں آدمی سرخ رو ہو جاتا ہے اور ذرا سی بات

میں سیاہ رُو۔ حباب کو قیام ہے لیکن بادشاہ کی نوکری کا کچھ قیام نہیں۔"

۲۳ر فروری کے پرچے میں خبر دی گئی ہے کہ ریحان الدولہ کا نو لاکھ کے قریب قرضہ بادشاہ کی طرف واجب الادا تھا۔ اور بادشاہ اُس پر ناراض ہو گئے ہیں۔ اکبر علی جمعدار کے بارے میں نامہ نگار لکھتا ہے کہ "یہ شخص لکھنؤ میں دریا کے کنارے مٹی کا حقہ لئے نہانے والوں کو پلایا کرتا تھا۔ اب سرکارِ واجد علی شاہ میں ان کو شمولِ عنایت ہوا ہے۔ اور دو سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے کام یہ ہے کہ مچھلیوں کی خوراک کے لئے کیڑے مہیا کریں۔"

۲۴ر مارچ کے شمارے سے یہ خبر ملاحظہ ہو:

"مٹیا بُرج میں مشہور ہے کہ ایک کارندہ نے بادشاہ کے لحاف کو جلا کر چاندی نکالی۔ کپڑے کے جلنے کی بُو سے بادشاہ نہایت ناراض ہوئے۔ اور اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ لحاف کسی کو دے دینا چاہیئے تھا۔ نہ کہ چاندی نکالی جاتی بادشاہ ایسے جزئیات کو دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ اسّی تولے چاندی نکلی تھی۔ مگر مٹیا بُرج میں لوگ کہتے ہیں کہ ایک سو پچاس تولے چاندی نکالی گئی۔ خیر ایسے معاملات ہوا ہی کرتے ہیں جہاں لاکھوں کا خرچ ہے۔ وہاں اتنی چاندی کو کون پوچھتا ہے۔"

اور آخر میں ۲۸ر جنوری کے شمارے سے یہ خبر ملاحظہ فرمایئے:

"مٹیا بُرج کی خبروں سے دریافت ہوا کہ ۹ر صفر المظفر کو بادشاہ سوار نہیں ہوئے۔ سلطان خانے ہی میں رہے۔ اور کبوتر بازی کا شغل

دیر تک ہوتا رہا۔ اس اثنا میں شہزادہ مرزا جوگی کے کبوتروں پر نظر جا پڑی اور کہا کہ یہ کون کبوتر اڑا رہا ہے۔ لوگوں نے کہا فلاں شہزادے ہیں۔ کہا اگر پھر ان شہزادے نے ایسی حرکت کی تو بادشاہ نہایت ناراض ہوں گے۔"

انیسویں صدی میں آدابِ صحافت

آدابِ صحافت کے اصول دنیا بھر میں مرتب کئے جا چکے ہیں انھیں تسلیم بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ آدابِ صحافت کی مکمل پابندی کہیں بھی نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں کے اخباروں میں سنجیدہ اور متین اخبار بھی موجود ہیں اور ہنگامہ پسند اخبارات بھی۔ ہنگامہ پسند اخبار تو خیر اکثر آدابِ صحافت کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ لیکن سنجیدہ اور متین اخبار بھی ان حدود سے کبھی کبھی تجاوز کر لیتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اخبارات کا مطالعہ کرکے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو صحافت کی عام پسماندگی اور بےحیثیتی کے باوجود آدابِ صحافت کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

"اخبار سائنٹفک سوسائٹی" (علی گڑھ) کی پیشانی پر یہ ماٹو درج ہوتا تھا:

"جائز رکھنا چھاپے کی آزادی کا ہے کام ایک دانا سیاست کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ہے کام ایک آزاد رعیت کا۔"

اس اخبار نے ۱۰ر مئی ۱۸۷۲ء کے شمارے میں لکھا :

"ہمارے بعض خاص عیب ہیں۔

۱۔ اظہارِ رائے اور نصیحت کے موقع کو بالکل نہیں جانتے۔

۲۔ ہمارے دلوں میں وہ سچی ہمدردی نہیں جس کا منہ سے دعویٰ کرتے ہیں۔"

اسی سال ۱۹ر دسمبر کے شمارے میں "پٹیالہ اخبار" رقمطراز ہے:

"ہماری یہ رائے ہے کہ جب تک ملکی زبان کے عام اخبار اپنی تہذیب میں کامل نہیں ہوں گے۔ ہندوستان کو عام تہذیب و ترقی کا حامل ہونا دشوار ہے اور یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ اخباروں کی کامل تہذیب اس وقت تک نا ممکن ہے جب تک ان کے ایڈیٹر، مالک اور کارسپانڈنٹ اور معاون اور ناظرین اور وہ تمام آدمی جن سے اخباروں کو کسی قسم کا علاقہ ہے، اخبار کی حقیقت اور ماہیت اور اصول اور اس کے ہر قسم کے اصولی اور فروعی اور خارجی حسن و قبح سے واقف و ماہر نہ ہوں گے۔"

انیسویں صدی کے اواخر میں مدراس سے ایک اخبار "مخبرِ دکن" کے نام سے نکلتا تھا جو ریاست حیدرآباد دکن کے امور پر شدید نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ اس کے مقابلے پر ایک اخبار "جریدۂ روزگار" ہوتا تھا۔ اس کا مسلک یہ تھا کہ دکن کی حکومت کی جا و بے جا تعریف کی جائے۔ اس معاصرانہ کشمکش کے دوران میں "مخبرِ دکن" نے بعض ایسی باتیں لکھیں جو آدابِ صحافت کے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ہمیں سخت تعجب ہے کہ ہمارے ہم عصر نے عمر بھر ایڈیٹری کی

لیکن ایڈیٹر کے فرائض اور اخبار کے اغراض و مقاصد سے انھیں اب تک خبر ہی نہیں ہوئی۔ "چندیں مدت خدائی کردی ہنوز گاؤ از خر نہ شناختی" کی مثل ان پر پوری صادق آتی ہے۔ ایڈیٹری اس کا نام نہیں کہ جھوٹی خوشامد کی جائے اور بے جا تعریفوں کے پل باندھے جائیں۔ جیسا کہ اخبار جریدۂ روزگار کا مشرب ہے۔ ہمارا بدخواہ سلطنت بننا صاحب جریدہ نے صرف اس بنا پر ٹھیرایا ہے کہ ہم نے چند عہدیداران سرکار نظام (خلداللہ ملکہٗ و دولتہٗ) کی بعض بے جا کارروائیوں اور خود غرضانہ کاموں پہ اعتراض کیا ہے۔ ذرا کوئی اس پیر مغاں سے پوچھے کہ آپ کا ارشاد یورپ والوں کی نسبت کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی شغل ان کے رگ و پے میں ساری ہے۔ اور یہی شوق انھیں دن رات لگا رہتا ہے۔ دیکھئے کوئی روز ایسا بھی گذرتا ہے جب کہ کسی نہ کسی ایڈیٹر نے کسی لارڈ یا ڈیوک کی کارروائی پر نکتہ چینی نہ کی ہو اور ان کے مصائب کی تصویریں ملک کے روبرو کھینچ کے نہ رکھ دی ہوں۔ کوئی کم بخت دن ایسا نہیں بسر ہوتا جب کہ لارڈ سالسبری یا لارڈ روزبری وغیرہ کے کاموں پر جرح و قدح نہیں ہوتا۔ یا ان کو آڑے ہاتھوں نہ لیا جاتا ہو۔ لیکن انھیں کوئی نہیں کہتا کہ یہ بدخواہ سلطنت ہیں۔ اور بدنام کنندۂ والئ ملک۔ بلکہ ان کے اعتراضوں پر نوٹس لیا جاتا ہے اور رغبت سے ان کی باتوں کو سنا جاتا ہے۔ مگر ہمارے مخاطب ہم عصر کا یہ حال ہے کہ ہم کو بدخواہ سلطنت اسلامی و بدنام کنندۂ ملک آصفی بتاتے ہیں۔ محض اس وجہ سے

کہ اپنا فرضِ منصبی برابر ادا کیا چاہتے ہیں"۔

اگرچہ اُنیسویں صدی میں سیاسی مذاق متعین نہیں ہوا تھا۔ اور سیاسی بیداری بھی بہت کم تھی۔ تاہم اس زمانے میں اخباروں نے ہر ممکن طریقے سے کام لیتے ہوئے کوشش کی کہ وہ جمہوریت کا آلہ بنیں اور اپنے فرائضِ منصبی ادا کریں۔ اس لئے وہ بار بار آزادیٔ صحافت کی تائید و حمایت میں یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے:

"اخباروں اور مطابع کو آزادی کا عنایت کرنا، یہ بھی سرکارِ وقت کی ایک بڑی دانائی کی دلیل ہے۔ اس سے اخبار نویسوں کو تو چنداں کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں سرکار و رعایا کے لئے یہ بڑے فائدے کی بات ہے سچی سچی باتوں کا اظہار، حکامِ ماتحت کی کارروائیوں کا انتشار، رعایا کی مصیبتوں اور سرکار کی بعض غلطیوں کا اظہار، یہ بہ جز اس کے ہو نہیں سکتا۔ کہ اخباروں کو آزادی ملے۔ اگر اخباروں کو آزادی عنایت نہ کی جائے۔ تو جو فائدے اب اخباروں کی بدولت سرکار و رعایا کو حاصل ہیں۔ وہ ہرگز حاصل نہ ہوں گے۔ اخباروں سے عدمِ آزادی میں کیا توقع ہو سکتی ہے۔ یہی کہ سچی باتوں کا اخفا جائز رکھا گیا۔ سارا اخبار خوشامد سے بھرا ہوا ہے۔ کام کی بات ایک نہ لکھی گئی۔ ہزاروں ظلم رعایا پر اور لاکھوں سازشیں رعایا سے عمل میں آئیں۔ مگر اخبار نویس نے اُن کو ایسا ظاہر کیا کہ ظلم کو عدل اور سازشوں کو قومی ہمدردی کے چلسے بتلا دیا۔ جب یہ صورت جائز رکھی گئی تو پھر سلطنت کو ترقی معلوم"۔

اُنیسویں صدی میں سر سید احمد خاں کے جرائد خاص طور پر آدابِ صحافت

پر کاربند تھے۔ اور ان کے زیر اثر جو اخبار برِعظیم کے مختلف شہروں سے نکلے اُن میں بھی آدابِ صحافت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن جب سرسید نے اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ شروع کی تو جو اخبار مخالفت میں نکلے۔ انھوں نے متانت چھوڑ کر گالی گلوچ کو شعار بنایا اور اس میں بہت آگے بڑھ گئے۔ آخری ربع صدی میں پنچ اخبارات برِعظیم کے طول و عرض میں نکلے لیکن مزاح ہر کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس لئے "اودھ پنچ" اور دو ایک اور اخباروں کے سوا باقی سب مزاحیہ اخبار پگڑی اچھالنے کا ذریعہ بن گئے۔ اور ان کی وجہ سے صحافتی اقدار کو ضعف پہنچا۔

انیسویں صدی کی اردو صحافت اور عوام کی ترجمانی

اردو صحافت کا آغاز غدر سے پہلے ہوا غدر کے بعد دہشت انگیزی کا دور شروع ہوا۔ انگریزوں نے اس ملک کو اپنے اقتدار کی آہنی زنجیروں میں جکڑ لیا اور دوسرے طبقات کی طرح اخبار نویس بھی اس زد میں آ گئے۔ بہرحال لکھنے والے اظہار خیال کا کوئی نہ کوئی ڈھنگ نکال ہی لیتے ہیں۔ چنانچہ غدر کے چند سال بعد اردو صحافیوں نے پرپرزے نکالنے شروع کئے۔ اس زمانے کے اخبارات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے گورے اور کالے کے امتیاز کو نکتہ چینی کا موضوع بنایا۔ اور پھر آہستہ آہستہ دوسرے سیاسی امور پر روشنی ڈالنی شروع کی۔

۱۸۷۶ء میں شاہ جہاں پور کے مقام پر ایک دیوانے انگریز نے تین ہندوستانیوں کو قتل کر دیا۔ جب اُس سے اس حرکت کی وجہ پوچھی گئی تو بولا کہ میں نے کان پور میں غدر میں مارے جانے والے یورپی باشندوں کی

یادگار دیکھا تو مجھے بے اختیار ہندوستانیوں کے خلاف اشتعال آیا۔ اور مجھے جو تین ہندوستانی پہلے نظر آئے میں نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سرسید کے "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" (علی گڑھ) نے ۱۲ رمئی ۱۸۷۶ء کی اشاعت میں لکھا۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس نادان یوروپین نے ان بے چارے ناکردہ گناہ ہندوستانیوں کے قتل کو اس ظلم کی مکافات تصور کیا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں کسی اور کی طرف سے ہوا تھا۔ اور جس میں ان مقتول ہندوستانیوں کو کچھ بھی دخل نہ تھا۔"

"ہم کو یاد ہے کہ اس بارہ میں ہم نے ایک رائے بھی دی تھی۔ جس کا منشا یہ تھا کہ ایسی یادگاریں ہمیشہ کینہ کو تازہ کریں گی اور فساد کو بڑھادیں گی۔ پس اسی طرح ہم اب یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری گورنمنٹ پر بہ نظرِ بقائے امن و امان ضروری ہے کہ وہ ایسی جملہ یادگاروں کو نیست و نابود کر دے۔"

۱۸۶۰ء کی تعزیراتِ ہند میں قاتلوں کے لئے ایک نئی گنجائش پیدا ہوئی اور کئی گوروں نے غریب ہندوستانیوں کو قتل کر کے اس گنجائش کا سہارا لیا۔ اور سستے ہی چھوٹ گئے۔ اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہی اخبار اسی سال ۱۵ رستمبر کے شمارے میں لکھتا ہے:

"قانونِ تعزیراتِ ہند کے اس حکم سے کہ اشتعالِ طبع کی حالت میں قتلِ عمد نہیں رہتا۔ اور اگر آلۂ قتل سے قتل نہ کرے تو قتلِ عمد نہیں ہوتا۔ یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ بے رحم لوگ

نہایت جری ہوگئے تھے اور ہر شخص اپنے دل کے غبار نکالنے اور قتل میں کامیاب ہونے کے واسطے اشتعال طبع کا حیلہ پکڑنے لگا تھا۔ مگر تاہم کچھ اندیشہ تھا اور جب سے کہ شاہ جہاں پور میں ایک گورے کے ہاتھ سے تین ہندوستانی مقتول ہوئے۔ اس وقت سے آلۂ قتل کی بھی چنداں پروا نہ رہی۔ اور لکھنؤ میں آج کل ایک چوکیدار کا شکار بندوق ہی سے ہوا۔ اور اگر آئندہ ایسے امور میں ڈاکٹروں اور جیوریوں کی نیت بخیر رہی تو پھر مقتول کے مریض ہونے اور قاتل کے نشہ باز ہونے سے بڑی گنجائش ہوگی۔ اور ہندوستانیوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔"

غالباً ۱۸۵۷ء میں حکومت ہند نے فیصلہ کیا کہ ہندوستانیوں کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس پر انگریزی جریدہ " انڈین پبلک اوپی نین " (لاہور) نے ایک مضمون لکھا ہے۔ " اخبار انجمن پنجاب " نے ترجمہ کر کے چھاپ دیا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اگر حکومتِ انگلیشیہ عوام سے بے انصافی نہ کریگی تو سرکشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ ہتھیار لے لینے سے ایک تو بداعتمادی کی فضا پیدا ہوتی ہے دوسرے ہندوستانیوں کی جنگی حرارت سرد ہو جائیگی اور وہ ہمیشہ دفاع کے لئے دوسروں پر تکیہ کریں گے مضمون نگار نے پوچھا:

"ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اندیشۂ بغاوت اس بات سے کم ہو جاوے گا اگر باشندگان کے اسلحہ اتار لئے جاویں گے اور ان سے سلوک بد کیا جاوے گا۔"

کالے اور گورے کا امتیاز ایسا بڑھا کہ حکومت گورے مجرموں پر گورے سپاہیوں کا پہرا رکھنے کی تجویز پر غور کرنے لگی۔ اس پر آگرہ اخبار "حیاتِ جاوداں" (آگرہ) نے ۱۸۸۲ء میں لکھا۔

"ہم مدت سے جانتے تھے کہ قیصرِ ہند کے عہدِ آسائش میں گوروں اور کالوں میں کچھ تمیز نہیں۔ دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس مفصلہ ذیل خبر نے ہمارے اس اعلیٰ خیال کو یک لخت منتقل کر دیا۔ نہ صرف منتقل کیا بلکہ آہ سرد بھڑک پڑا۔ اے ناظرین! وہ خبر کیا ہے؟ سن لیجئے۔

ایک اخبارِ معزز سے معلوم ہوا۔ کہ گورنمنٹ تجویز کر رہی ہے کہ گورے مجرموں پر گورے سپاہیوں کا پہرا ہو۔ ہائے رے قومی تعصب۔ جس نے ہماری دانا بینا گورنمنٹ کے خیالات کو پلٹ دیا۔ گورنمنٹ کو گوروں کی خاطرداری کس قدر منظور ہے گورنمنٹ گوروں کے مزاج سے جل بل گئی۔ لیکن افسوس، بہت سے دیسی گوروں کے ہاتھ تباہ ہو گئے۔ اکثروں نے دیسیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا۔ مگر کوئی نہیں۔ اکثر عدالت سے بری کئے گئے۔ ہائے رے افسوس، ہائے افسوس، ہندوستان کم بخت! تو کب اپنی تاریک جہالت سے سر اٹھائے گا۔"

انگریز ہندوستانیوں سے دور رہتے تھے وہ ہندوستانیوں سے تعلق رکھنے میں ہیٹی سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ہندوستانی مہذب نہیں تھے۔ اس کے علاوہ انگریز افسروں کا طرزِ عمل اکثر ایسا ہوتا تھا جس سے ہندوستانیوں کو سخت غصہ آتا تھا۔ چنانچہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے

دو مرتبہ بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ حکمران نسل کے افسروں پر نکتہ چینی کی ۲۳ر دسمبر ۱۸۷۵ء کے شمارے میں درج ہے :۔

"ہندوستانی کتنے ہی علوم و فنون میں کمال حاصل کریں اور کتنے ہی دیانت دار اور خوش کردار ہو جائیں مگر وہ انگریزوں کے نزدیک بے ایمان اور غیر مہذب ہی رہیں گے۔ اور انگریز چاہے جتنی ہی بد اعمالیاں کریں مگر وہ شریف کے شریف ہی ہیں۔"

اسی اخبار نے ۳۱ر مارچ ۱۸۷۶ء کے شمارے میں ایک مضمون میں بتایا کہ سرکاری انتظامات سے لوگ کیوں متنفر ہوتے ہیں اس مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے :۔

"اب یہاں تک تو ہم نے سرکاری تدابیر سے فائدہ حاصل نہ کرنے کے ان اسباب کو بیان کیا جو خاص رعایا کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں۔ اب ہم اُن اسباب کو بیان کرتے ہیں جو خاص انتظام ہی کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔ من جملہ ان کے ایک ان ملازموں کی کج اخلاقی اور ظلم اور زیادتی ۔ اور اگر ہم سچ سچ کہیں ۔ تو بعض اوقات ان کی بد معاشی اس بات کی باعث ہے۔ کہ ہندوستانی ان کی صورت دیکھنے اور ان کے پاس جانے سے اپنا مرنا بہتر جانتے ہیں۔"

اُنیسویں صدی کے تیسرے ربع میں نیابتی ادارے موجود ہی نہیں تھے ۔ اس لئے کوئی ایسی صورت نہیں تھی کہ انگریز نظم و نسق میں ہندوستان کے باشندوں کی امداد حاصل کرتے ۔ بہر حال نمائندہ اداروں کے قیام کی تجویز پر اخباروں میں بحث ضرور ہوئی ۱۸۶۷ء میں لندن کی ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن میں مسٹر ڈبلیو، سی، بنرجی نے ایک مقالہ پڑھا ۔ جس میں

ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر بڑی شرح وبسط سے روشنی ڈالی گئی۔ مسٹر بنرجی نے دلائل وشواہد کی مدد سے ثابت کیا کہ ۱۸۵۷ء میں جو انقلاب ہوا اس کی ذمہ داری انگریزی راج کے اُن نقائص پر ہے جنھیں دُور کرنے کی سعی نہ کی گئی۔ اُنھوں نے بتایا کہ پارلیمنٹ کے ممبروں کی اکثریت ہندوستان کے مسائل سے ناواقفِ محض ہے ۶۵۸ ممبروں میں سے بیس ممبروں نے بھی ہندوستان نہیں دیکھا اور جو دیکھ چکے ہیں۔ وہ بھی مسائل سے واقف نہیں۔ آخر میں بنرجی نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں ایک ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جائے۔ جس میں یہاں کے باشندوں کے نمائندے بھی شامل ہوں۔ ہندوستان کے بہت سے اخباروں نے یہ مضمون چھاپا۔ اور اس پر تبصرے بھی ہوئے۔ جن میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے نمایاں حصّہ لیا

جب انڈین نیشنل کانگرس قائم ہوئی۔ اور مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی اور نیابتی اداروں کی ضرورت پر زیادہ شدت سے زور دیا جانے لگا۔ تو اخبارات اس میں پیش پیش تھے۔ البرٹ بل کے مسئلے پر اخباروں نے بڑے دھڑلے سے قومی زاویۂ نگاہ پیش کیا۔

جب انگریزی افواج نے حبشہ پر حملہ کیا۔ تو اس کے اخراجات کا کچھ بوجھ ہندوستان پر ڈالا گیا۔ اس پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے لکھا کہ اس جنگ سے ہندوستان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے اس پر بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔ ادھر لاہور کے اخبار "ریفارمر" نے اس امر کی مخالفت کی کہ عیسائی پادریوں کو سرکاری خزانے سے روپیہ دیا جائے۔

حسرت موہانی اور "اردوئے معلیٰ"

بیسویں صدی کے آغاز کا ذکر ہے۔ جاپان روس کو شکست دے چکا تھا۔ اور ایشیائی قوموں میں بیداری کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ ایران میں "مشروطہ" کی تحریک نے اسلامی دُنیا کو جمہوریت سے آشنا کر دیا تھا۔ اور سلطنتِ عثمانیہ میں انجمنِ اتحاد و ترقی کی انقلابی تحریک نے آمرانہ نظام کا تختہ اُلٹ دیا تھا۔ برِعظیم پاک و ہند میں بھی ان تحریکوں کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ بال گنگا دھر تلک آربندو گھوش اور بپن چندر پال بدیشی مصنوعات کے مقاطعہ اور سودیشی مصنوعات کے فروغ کا نعرہ گھن گرج کے ساتھ بلند کر رہے تھے۔ لیکن پنجاب اور بنگال میں جو ہنگامے ہوئے وہ حقیقت میں غیر مسلموں کے ہنگامے تھے۔ اور مسلمان ابھی تک سرسید کی تحریک کے زیرِ اثر سیاست کو یا تو شجرِ ممنوعہ کہتے تھے یا مسلم لیگ کی نرم و نازک سیاست کے قائل تھے۔ جو اُن دنوں محض عرض داشتوں تک محدود تھی۔ اور عام احساس یہی تھا کہ ؎

اس سے آگے بڑھو تو شرارت کی بات ہو

یہی حال صحافت کا تھا۔ لاہور میں اخبار "پنجابی" اور کلکتہ میں "بندے ماترم" سامراج کے خلاف تیز و تند اور ترش مضامین چھاپتے تھے اور مسلمان اخبار مثلاً "پیسہ اخبار" (لاہور) "وطن" (لاہور) اور "وکیل" (امرتسر) انتہا پسندوں کی شورش کو بے حد ناپسند کرتے تھے۔ ابھی تک نہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی شعلہ بیانی کا آغاز کیا تھا۔ نہ محمد علی نے "کامریڈ" نکالا تھا۔ نہ "ہمدرد" موجود تھا۔ اور نہ مولانا ظفر علی خاں نے سامراج کے کاسۂ سر کو اپنے گرزِ البرز شکن کی ضربِ کاری سے نوازا تھا۔ غرض مسلمانوں پر ایک سکوت طاری تھا۔ اور وہ انتہا پسند تحریکوں سے کچھ سہمے سہمے سے تھے۔ ایسے میں مولانا حسرت موہانی نے جرأتِ رندانہ سے کام لیا اور ایسا نعرۂ مستانہ بلند کیا کہ ایک طرف مسلمان ٹھٹک کر رہ گئے۔ دوسری طرف حکومت نے اپنی جناب میں اس گستاخی کو پسند نہ کیا۔ بلکہ اس بے تکلفی پر ناک بھوں چڑھائی اور انھیں دو سال کے لئے جیل میں بند کر دیا۔

جب انیسویں صدی ماضی کا جزو بن رہی تھی۔ اُس وقت حسرت موہانی علی گڑھ کالج میں بی اے کے طالب علم تھے۔ اجنبی راج کے جانی دشمن تھے اور اپنے خیالات طلبہ میں پھیلانے کی سعی کرتے تھے۔ حسرت گرم سیاست کے علم بردار تھے اور علی گڑھ کے اربابِ بزم سیاست سے رشتۂ مناکحت استوار کر چکے تھے۔ اس سے کشمکش کا دروازہ کھلا۔ اس محفل سے تین بار نکالے گئے پھر بھی "صراطِ مستقیم" پر نہ آئے کہ سے بڑھتا تھا ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد

بی اے کرنے کے بعد اس شہر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ وہ ایک طرف اعلیٰ پایہ کے شاعر اور ادیب تھے۔ دوسری طرف سیاست سے دلچسپی لیتے تھے۔ اور سیاست بھی ایسی کہ مسلمان اس سے بدکتے تھے۔ کوئی ایسا اخبار

یا رسالہ موجود نہیں تھا جس کے ذریعہ سے وہ اپنے خیالات لوگوں تک پہنچاتے۔ اس لئے اُنھوں نے " اردوئے معلیٰ " کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ جو اُن کے ذوق کے دونوں پہلوؤں کو آسودہ کرتا تھا۔ اس میں ایک طرف اساتذۂ قدیم کے دواوین مع مقدموں کے شائع ہوتے تھے اچھے اچھے علمی مقالے چھپتے تھے بڑے بڑے شعراء کا کلام پیش کیا جاتا تھا اور دوسری طرف اس زمانے کی سیاست پر پُر مغز اور تیز و تند مضامین درج ہوتے تھے۔ جن کے لکھنے والوں میں آربندو گھوش، بپن چندر پال اور مولوی برکت اللہ جیسے انقلابی شامل تھے

علمی و ادبی پہلو اس وقت میرے سامنے "اردوئے معلیٰ" کے ۱۹۰۷ء کے چند پرچے موجود ہیں۔ مئی ۱۹۰۷ء کے پرچے میں سب سے پہلے مرزا محمد ہادی مدیر "الحکم" (لکھنؤ) کا ایک مراسلہ درج ہے۔ جس میں تجویز پیش ہوئی کہ سالِ آئندہ یعنی ۱۳۲۵ ہجری میں میر تقی میر کی صد سالہ برسی منائی جائے۔ ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہو جس میں میر کے سوانح اور شاعری پر مقالے پڑھے جائیں۔ میر کے زمانے کی شاعری کا موجودہ شاعری سے موازنہ کیا جائے اور ایک مشاعرہ میر کے کسی مصرع طرح پر کیا جائے۔ اس کے بعد راسخ عظیم آبادی پر حسرت موہانی کا ایک مقالہ درج ہے جس کے آخر میں لکھا ہے۔ کہ راسخ کی دو غزلوں میں "میر کا رنگ یہاں تک پیدا ہے کہ اگر وہ میر کی چند منتخب غزلوں میں شامل کر کے پیش کی جائیں تو غالباً اربابِ بصیرت بھی دونوں کا فرق دریافت نہ کر سکیں گے" اس شمارے میں اور ادبی مواد بھی موجود ہے۔ مثلاً مصری اخبار "اللواء" سے قومی شاعری پر ایک مختصر مضمون میں لکھا ہے:

"جب کوئی شعر کسی وطن پرست شاعر کے دماغ سے نازل ہو کر

عالم وجود میں آتا ہے۔ تو وہ دنیا میں ایک نئی چہل پہل پیدا کرتا ہے۔ نوعِ انسان کی روحوں کو ترقی کی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ اور خوبیوں اور نیکیوں کو کرۂ زمین کی سطح پر پھیلاتا ہے۔"

پی۔جی۔ہمرٹن کے ایک مضمون کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ جس کا عنوان ہے: "ایک خط ایسے مصنف کے نام، جو سخت دماغی محنت کا عادی تھا۔" شعر و شاعری کا عنصر بھی موجود ہے۔ مثلاً خان بہادر میر ناصر علی کی بیاض کا انتخاب اور شاد عظیم آبادی اور دوسرے شعراء کا کلام درج ہے۔

اس رسالے کا تہذیبی پہلو بھی دیکھنے کے قابل ہے "فنونِ لطیفہ اور اسلام" پر مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی (مدیر، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ) کا مقالہ نہایت خیال افروز ہے۔ اور آج بھی اس سے بہت کچھ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام فنونِ لطیفہ کی تعلیم کا مخالف نہیں۔ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اور خود آنحضرتؐ فنونِ لطیفہ کے بڑے سرپرست اور حامی تھے۔ اس مضمون سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"اسلام کے احکام کا صحیح اور مستند معیار، جس پر ساری دنیائے اسلام متفق ہے، قرآن مجید کے سوا اور کوئی کتاب نہیں ہے اس مقدس کتاب میں کہیں کوئی ایسا حکم مندرج نہیں ہے کہ مسلمانوں کو مصوری، نقاشی، شاعری، موسیقی اور فنِ آراستگی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ فنون اُن کے لئے ناجائز قرار دیئے گئے ہیں۔ احادیث میں مورتیں اور صورتیں بنانے کی جو مخالفت ہے وہ عام حکم نہیں ہے۔ بلکہ جو مورتیں اور صورتیں اُس زمانے میں

بتوں اور دیوتاؤں کی بنائی جاتی تھیں اور جن کی اہلِ عرب پرستش کرتے تھے۔ یہ ممانعت اُنہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ آنحضرتؐ ایسی مسند پر جلوہ افروز ہوا کرتے تھے جو منقش اور زرکار تھی۔ صحابہؓ کے پاس روم اور ایران سے ایسے کپڑے آتے تھے جو حیوانوں اور انسانوں کی تصویروں سے آراستہ ہوتے تھے۔ اور وہ اُن کو فرش، پوشاک، اور بستر کے طور پر کام میں لاتے تھے۔ رومیوں کے سکے سونے اور چاندی کے، عرب میں عام طور پر رائج تھے۔ اور ان پر سلاطینِ روم کی تصویریں منقش ہوتی تھیں۔ ادادیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے مزمار اور دف پر گانے والوں کے نغمے کئی بار سُنے تھے۔ عرب کے بعض مشہور شعراء کا کلام آپؐ کو یاد تھا۔ اور آپؐ نے صحابہ کو اُن کے اشعار پڑھ کر سنائے تھے۔ بعض نامور صحابی کامل شاعر تھے۔ اور اُن کا کلام آج تک موجود ہے۔ آنحضرتؐ ہر جمیل چیز کو پسند فرماتے تھے اور قدرت کے جمال سے متاثر ہوتے تھے۔"

(مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

اس کے بعد مولانا وحید الدین سلیم نے لکھا:

"اس عام ولولے اور جوش کے زمانے میں، جب کہ اسلام ہر طرف بیدار نظر آتا ہے۔ اور ہر ملک کے مسلمان قدیم تعصبات اور اوہام کی زنجیروں سے آزاد ہو رہے ہیں اور یقین کرنے لگے ہیں کہ اسلام کسی علم اور کسی فن کی تعلیم سے مانع نہیں ہے۔ اور زمانۂ حال کے تمدن اور مسلمانوں کے قدیم تمدن میں ایک طرح کی مشابہت ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو لازم ہے کہ فنونِ لطیفہ کی تعلیم حاصل کریں اور اُن کے ذریعہ سے اپنے دل و دماغ کو

روشن کریں۔ اپنے خیالات کو بلندی پر لے جائیں اور اپنے جذبات کو نئے سانچے میں ڈھالیں۔" (صفحہ ۱۳-۱۴)

سیاسی پہلو

اب ہم اس رسالے کے سیاسی مواد کو لیتے ہیں "ہندوستان کے روحانی لیڈر" کے عنوان سے منشی غلام قادر خاں فصیحؔ کا ایک مضمون "پنجاب جرنل" (سیالکوٹ) سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں روحانی رہنماؤں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ جہاں لوگوں کو روحانی تعلیم دیں وہاں اُنھیں سیاسی تربیت بھی دیا کریں۔ اور اُنھیں تلقین کریں کہ دیسی مصنوعات استعمال کیا کریں۔ ایک مضمون کا عنوان ہے "اضطراری فوائد کا شکریہ ضروری نہیں"۔ یہ لندن کے ماہانہ رسالہ "انڈین سوشیالوجسٹ" سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے مطالب اس اقتباس سے واضح ہوتے ہیں:

"انگریزی حکومتِ ہند کے اغراض میں خلوصِ نیت ابتدا ہی سے نہیں ہے۔ کیونکہ ان اغراض کی بنا طمعِ زر اور ہوسِ اقتدار پر قائم ہوئی تھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اہلِ ہند کو اگر کوئی نفع برٹش گورنمنٹ سے اتفاقی طور پر حاصل ہو جائے۔ تو وہ اس کے ممنون بھی ہوں"

اُس زمانے میں جو محبانِ وطن ہندوستان چھوڑ کر غیر ملکوں میں جا بسے تھے۔ اور وہاں سے آزادیٔ وطن کے لئے سعی کرتے تھے۔ اُن میں مولوی برکت اللہ بھی شامل تھے۔ اُنھوں نے "ہندو مسلمان در ہندوستان" کے عنوان سے نیویارک سے ایک طویل فارسی مضمون بھیجا۔ یہ بھی اسی شمارے میں درج ہے۔ اور اس میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرنی چاہیئے۔ بہر حال اس

شمارے کا سب سے اہم مضمون "بے چینی کے آثار" ہے جو حسرت موہانی نے خود لکھا تھا۔ اس میں شورشِ لاہور و راولپنڈی اور شورشِ بنگال کے اسباب کی تحلیل کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"ہمارے خیال میں رعایا کو اپنی پولیٹکل دشواریوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیئے اور مسٹر بپن چندر پال کی طرح عین وقت پر فرار ہو جانے کی پالیسی کو قابلِ احتراز سمجھ کر ہم لوگوں کا فرض ہونا چاہیئے کہ امرِ حق کے اظہار میں مطلق باک نہ کریں۔ اور صداقت کی آخری فتح پر یقینِ کامل رکھتے ہوئے راہِ حق میں جو مصائب پیش آئیں۔ ان کو بہ کشادہ پیشانی برداشت کریں اور خوب سمجھ لیں کہ آزادی کی دولت آسانی سے نہیں حاصل ہوا کرتی۔ یہ جو حکومت کی جبروت سے بہ ظاہر تحریکِ حریت کو فاش شکست ہوئی ہے۔ اس پر افسردہ و مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی تک ہماری قوت نہ مجتمع ہے نہ منظم۔ اور اس لئے ہم کو ابھی کچھ دنوں تک ایسی ایسی بہت سی ناکامیوں اور شکستوں کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنا پڑے گا اور پھر ہر موقعہ پر اپنی حالت کے اندازہ کے مطابق کامیابی کی نئی نئی تدبیروں پر اکثر اوقات بالکل از سرِ نو عمل پیرا ہونا ہوگا۔ سرِ دست ہمارے نزدیک ہر محبِ ملک کو انگریزی تشدد کے مقابلے میں مزاحمتِ دفاعی یعنی PASSIVE RESISTANCE کی پالیسی پر کاربند ہو کر انگریزی مال کے خرید نے بلکہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد پہنچانے سے قطعی انکار کر دینا چاہیئے۔" (مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۴۵)

۱۹۰۸ء میں حسرت موہانی نے ایک اور تیز مقالہ لکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

اُنھیں دو سال سزائے قید کا حکم سنایا گیا۔ اسی سال اور لوگ بھی پکڑے گئے۔ مدراس کے مسٹر چلے کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ سریندر ناتھ آریہ دس سال کے لئے جیل میں بند ہو گئے۔ موتی لعل سات سال کے لئے پابہ زنجیر ہو گئے۔ اور بال گنگا دھر تلک کو چھ سال قید کا حکم سنایا گیا۔ جس پر بمبئی اور مہاراشٹر میں بلوے بھی ہوئے۔ ان سب گرفتاریوں پر مسلمانوں کی نرم سیاست کا ردِ عمل کیا تھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے ماہنامہ "عصرِ جدید" میرٹھ (زیر ادارت خواجہ غلام الثقلین) سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اس کا کیا علاج ہے؟ کیا پارلیمنٹری حکومت اس کا علاج ہو سکتا ہے؟ مگر ایسی گورنمنٹ سے نہ انگریز خوش ہیں نہ مسلمان۔ نہ ہنود کے وہ طبقے جو ذات اور تعلیم میں گھرے ہوئے ہیں۔ اور چند متموّل اور رسوخ طلب اونچی جاتوں کا عمل اُن کے لئے مناسب نہ ہوگا۔ جب تک کل باشندگانِ ملک میں اعتدال، خود ضبطی، اور انصاف کا خیال کم از کم تعلیم یافتہ طبقے میں نہ پیدا ہو جاوے۔ اس قسم کے خیالات مضر اور خود ملک کے لئے تباہ کن ہیں۔ مجارٹی اور مینارٹی کا مسئلہ سخت سدِ راہ ہے ؎
>
> تو کارِ زمیں را نکو ساختی
>
> کہ با آسماں نیز پرداختی
>
> عصرِ جدید۔ اگست دسمبر ۱۹۰۸ء)

حسرت موہانی جیل سے لوٹے تو سامراج کے خلاف اُن کے خیالات اور پختہ ہو چکے تھے۔ لوگوں نے مشورہ دیا۔ کہ اوّل تو "اردوئے معلیٰ" سیاست سے کنارہ کش ہو جائے۔ اور اگر سیاست میں اتنی ہی دلچسپی ہے۔ تو کانگرس

کے اُس فریق کا ساتھ دیا جائے۔ جو نرم سیاست کا علمبردار ہے۔ اس پر نومبر ۱۹۰۶ء کے شمارے میں آپ نے "اردوئے معلیٰ کی پالیسی" کے عنوان سے ایک اداریہ میں دوستوں کے مشورے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا:

"مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدہ، عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، ایک ایسی چیز ہے۔ جس کو محض کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کرنا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے۔ جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔ پالٹیکس میں ہم مقتدائے وطن پرستاں مسٹر تلک، اور سرگروہِ احرار بابو آربندو گھوش کی پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس حیثیت سے فیروز شاہی کانگرس سے ہم کو اتنی ہی بیزاری ہے جتنی امیری مسلم لیگ یا نوزائیدہ لال چندی کانفرنس سے۔ اور ہمارے خیال میں یہ بیزاری بالکل حق بہ جانب ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی رفتار اور اہلِ دنیا کے طبائع کا میلان صریحاً حریت کی جانب ہے۔ چنانچہ خوابیدہ براعظم ایشیا میں بھی ہندوستان کے سوا اور کوئی بڑا ملک آزادی کی نعمت سے محروم نہیں ہے۔ پس عقل سلیم کسی طرح باور نہیں کر سکتی کہ تمام عالم میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس کی قسمت میں محکومیٔ دوام کی ذلت لکھ دی گئی ہو۔ ایسا گمان بہ ظاہر مشیتِ ایزدی کے سراسر خلاف نظر آتا ہے۔"

بحث کو جاری رکھتے ہوئے حسرت موہانی نے اس رائے کا اظہار کیا کہ مسلم لیگ، ہندو کانفرنس اور کانگرس کا نرم فریق صرف اس قدر چاہتے

ہیں کہ ہم غلام سے ترقی یافتہ غلام یا محکوم سے خوشحال محکوم ہو جائیں۔ اس کے برعکس تلک اور گھوش آزادیٔ کامل کے طلبگار ہیں اس لئے ہم اُن ہی کے حامی ہیں۔

بہر حال اس سے یہ مراد لینا بالکل غلط ہوگا کہ حسرت موہانی برعظیم کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل سے بالکل غافل تھے۔ اگر ان کی تحریروں کا ذرا غور سے جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے۔ کہ وہ دو قومی نظریے کے بھی حامی تھے۔ اور مسلمانوں کی الگ سیاسی تنظیم کے بھی قائل تھے۔ اور یہ رائے بعد میں نہیں، سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے قائم تھی اور آخر وقت تک قائم رہی۔

جب آل انڈیا مسلم لیگ کے رہنما نواب وقار الملک بہادر نے مسلمان نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ فقرے کہے کہ :

"ہر ایک حالت میں تم اپنے تئیں انگریزی فوج کے سولجر خیال کرو تم تصور کرو۔ کہ انگریزی پرچم تمہارے سروں پر لہرا رہا ہے تم یقین کرو کہ تمہاری یہ دوڑ دھوپ اس لئے ہے کہ تم ایک دن تاجِ برطانیہ پر اپنی جانیں نثار کرو۔"

تو حسرت موہانی نے لکھا کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ اس سے ہمیں مایوسی ہو۔ کانگرس کے نظریات بھی ابتدا میں یہی تھے۔ لیکن بیس سال کے اندر اندر اُس کا رنگ بدل گیا۔ مسلمان چند سال قبل سیاست سے کنارہ کشی ہی درست سمجھتے تھے۔ آج وہ سیاست میں حصّہ لے رہے ہیں۔ اور گمان غالب یہی ہے کہ پولٹیکل میدان میں در آنے کے بعد جس وقت اُن کے جذبۂ حریت میں تحریک پیدا ہوگی۔ اُس وقت مسلمان کبھی محض انگریزوں کی اطاعت و خدمت کے

اقتدار پر قانع نہ رہ سکیں گے۔" آپ نے مسلمانوں کی کمزور پالیسی کی وجہ یہ بتائیں "تعلیم کی کمی" آغاز حریت کی قدرتی جھجک، سرکاری ملازمتوں کا بآسانی مل جانا اور دوسری قوموں کے ساتھ رقابت" آپ نے کہا۔ جب مسلمان ہندوؤں کے برابر ہو جائیں گے۔ تو:

"اس وقت یقیناً وہ طلب حقوق میں زیادہ بے باک ہو جائیں گے۔ کیونکہ حریت کی خواہش ایک ایسی خواہش ہے جس کی ابتدا ضرور ہوتی ہے۔ لیکن انتہا نہیں ہو سکتی۔ یعنی ایک بار دل میں پیدا ہو کر وہ برابر بڑھتی رہتی ہے۔ گھٹنے کا نام نہیں لیتی۔" (۱۹۰۷)

اس مقالے میں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے اُنھیں دو قومیں قرار دیا۔ اس کے بعد نومبر ۱۹۰۹ء کے شمارے میں بپن چندپال کا ایک مضمون درج کیا جس میں "مسئلہ مسلمانان و ہنود" کے زیر عنوان درج شدہ دو پیراگراف حقیقت میں مسلمانانِ ہند کی اُس پالیسی کے ترجمان ہیں جو ۱۹۰۶ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۰۷ء میں ترک کرنا پڑی کیونکہ ہندو اس کے قائل نہیں تھے ملاحظہ ہو اقتباس:

مسئلہ مسلمانان و ہنود

"بہرحال وطن پرستانِ ہند کو کسی نہ کسی روز یہ مسئلہ ضرور حل کرنا ہوگا۔ ہندوؤں کو تو یہ ماننا پڑے گا کہ سلطنتِ ہند کی عام زندگی میں مسلمان بھی اُن کے ہم پلہ ہیں۔ اور مسلمانوں کی علیحدگی کا خبط اور افضلیت کا گمان دماغ سے نکالنا اور ہندوستان کی قوم الاقوام وہ قوم جو مجموعہ ہوگی بہت سی قوموں کا، کے ایک جزو کی حیثیت سے اپنے جائز رتبے کو قبول کرنا ہوگا۔"

"غرض کہ ہمیں اس دشواری کا مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ اس کے حل کرنے میں بطور دفع الوقتی چند روزہ التوا ر بے شک ممکن ہے لیکن ہمیشہ کے لئے اس سے پہلو تہی کرنا محالات سے ہے۔ پس اس مسئلے کے لئے سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ اس کا فیصلہ اسی زمانے میں ہو جائے جب کہ اہلِ برطانیہ کی زبردست قوت ملک میں موجود ہے جس کی وجہ سے ان دونوں قوموں میں جسمانی کشمکش یا خونریزی کسی طرح نہ ہونے پائے گی" (نومبر ۱۹۰۹ء)

آنے والے اکتیس سالوں میں ہندو مسلم مفاہمت کی بے شمار کوششیں ہوئیں جن میں صرف ایک کوشش ۱۹۱۶ء میں کامیاب ہوئی۔ آخرِ کار ۱۹۴۰ء میں مسلمانوں کو پاکستان کا مطالبہ کرنا پڑا۔ حسرت موہانی کے خیالات میں واضح انقلاب ۱۹۲۴ء میں آیا۔ جب انھوں نے ہندوؤں کے فرقہ پرستانہ عزائم اور شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں کے پیشِ نظر بھانپ لیا۔ جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ ہندوستان میں مسلم اکثریتی علاقوں کی الگ ریاستیں قائم ہوں۔ بلکہ ہندو انڈیا کے اندر بھی جہاں کسی چھوٹے سے علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو، وہاں ایک خود مختار ریاست قائم کر دی جائے۔ اور اس کے بعد ہندو اور مسلمان ریاستیں ایک فیڈریشن میں منسلک ہو جائیں یہی وہ منصوبہ تھا جس کا ذکر کرنے کے بعد لالہ لاجپت رائے نے ۱۹۲۵ء میں برعظیم کی تقسیم کے سلسلے میں اپنی تجویز پیش کی۔ اس کے بعد ایک ربع صدی تک حسرت موہانی کے خیالات کم و بیش وہی تھے جو آل انڈیا مسلم کانفرنس میں شریک ہوئے۔ جب مسلم لیگ دو متوازی جماعتوں میں بٹ گئی تو حسرت موہانی سر شفیع کی لیگ سے وابستہ ہوئے۔ جو جداگانہ انتخاب پر پختہ یقین

دکھتی تھی۔ اور پھر ۱۹۳۴ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ تو اس میں بھی حسرتؔ پیش پیش تھے۔ تا آنکہ پاکستان بن گیا۔ اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ کہ جہاں لیگ کے بڑے بڑے قائد ہندوستان چھوڑ کر پاکستان میں آ گئے۔ حسرتؔ موہانی اُن ہی عوام کے دُکھ اور سکھ میں شریک رہے جن سے وہ شروع سے وابستہ تھے۔

مولانا حسرتؔ موہانی کے بارے میں میرے تاثرات کا ملخص یہ ہے

۱۔ وہ سامراج کے دشمن اور آزادیٔ کامل کے پرستار تھے۔ لیگ اور کانگریس دونوں میں اُن ہی نے آزادیٔ کامل کا نعرہ سب سے پہلے بلند کیا۔

۲۔ وہ مسلمانوں کو علیحدہ قوم تصوّر کرتے تھے۔ انھوں نے برِعظیم کی تقسیم کا تصور ۱۹۲۴ء میں پیش کیا۔

۳۔ وہ خالص عوامی رہنما تھے۔ زندگی افلاس میں کٹی۔ لیکن طبیعت میں ایسی قناعت تھی کہ اس پر ہزار دولتیں قربان تھیں۔

۴۔ ان کا مجلہ "اردوئے معلیٰ" اردو کی مجلّاتی صحافت میں ایک خصوصی انفرادیت کا مالک تھا۔ اور اس کے ذریعے سے اُنھوں نے ادب اور سیاست دونوں کو فروغ دیا۔

۵۔ وہ ایک نڈر صحافی اور رہنما تھے۔ اُنھوں نے اپنے قلم اور زبان کی عصمت ہمیشہ محفوظ رکھی۔ اور اس سعی میں زندگی کے کئی سال پسِ دیوارِ زنداں گزار دیئے۔

شمسِ بنگالہ

بنگال کا ایک علمی ماہ نامہ

نومبر ۱۹۰۷ء کا ذکر ہے۔ کلکتہ سے "شمسِ بنگالہ" کے نام سے ایک علمی و ادبی ماہنامہ جاری ہوا۔ چھ مہینے کے بعد اس کا نام صرف "شمس" قرار پایا۔ اس کی ترتیب کے ذمہ دار ابتداء میں مولوی بدء الزماں بدرؔ تھے اُن کے بعد حبیب النبی خاں صولتؔ اور دلیل الدین احمد حسرتؔ ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے چند شماروں پر مشتمل ایک فائل پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے نے بنگال میں اردو کی کتنی بڑی خدمت سرانجام دی۔

پہلے رسالے کی وجہ تسمیہ ملاحظہ ہو۔ شیخ خیر الدین احمد اشکؔ بلندشہری نے اکتوبر ۱۹۰۸ء کے شمارے میں رسالے پر ایک منظوم تبصرہ کیا جس کے چند شعر یہ ہیں:

جنت مکان حضرتِ نساخ اب کہاں؟
باقی کہاں ہے آج وہ جود و علائے شمس

قائم رکھے گا حضرتِ نسّاخ کا یہ نام
ہوگا کبھی یہ شمس، ہے وجہ بقائے شمس
قائم جنابِ شمس کی ہو ایک یادگار
اس کے سوا نہیں ہے کوئی مدعائے شمس

حضرتِ نسّاخ سے مراد کلکتہ کے مشہور شاعر مولوی عبدالغفور نسّاخ تھے۔ اور جنابِ شمس سے نسّاخ کے فرزند ابوالقاسم شمس جو اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ اور نہ صرف شاعر تھے، بلکہ شاعر گر بھی تھے کہ اُن کے شاگردوں میں مولوی رضا علی وحشت بھی شامل تھے جن کی قادرالکلامی کی سب داد دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ رسالہ ابوالقاسم شمس ہی کی یاد میں جاری کیا گیا۔

"شمسِ بنگالہ" یا "شمس" کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجئے گا کہ شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ دہلوی نے ایک مضمون میں اسے خراجِ تحسین ادا کیا۔ مضمون کا عنوان ہے "آفتاب" اس کا پہلا پیرا اس رسالے کے بارے میں ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"ہندوستان کے مشرق سے شمسِ بنگال طلوع ہوا ہے اس لئے شمس پر شمس العلماء مضمون لکھتا ہے۔ لیکن مضمون کی تحریر سے پہلے خداتعالیٰ سے یہ دُعا مانگتا ہے۔ کہ جیسا اس کا نام شمس ہے۔ ایسا ہی اُس کا کام ہو۔ زمین پر جیسے آفتاب کی شعاعوں سے تاریکی روشن ہوتی ہے۔ ایسے ہی اس شمس سے خلقت کی تاریکیٔ جہل علم کی روشنی سے روشن ہو۔ جیسے مہرِ جہاں تاب کی حرارت سے سردی کی کلفت دور ہوتی ہے۔ اس

سے بھی خلائق کی مردہ دلی کی سردی دور ہو کر زندہ دلی کی گرمی پیدا ہو۔ جیسے آفتاب سے کھیت سرسبز و شاداب ہوتے ہیں۔ اور گُل و غنچے کِھلتے ہیں۔ ایسے ہی اس سے علم کے پھول شگفتہ ہوں۔ اور دماغ باغ باغ ہوں۔ جیسے سورج سے میوے اور پھل پختہ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی اس سے خام خیالوں کے خیالات پختہ ہوں جیسے شمس سے قوسِ قزح میں رنگ طرح طرح کے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے ہی اس سے صنائع و بدائع کے چمن رنگ برنگ کے بوستانِ سخن میں سرسبز ہوں۔ جیسے مہرِ جہاں تاب زمین پر سے بخارات اُڑا کر آسمان پر لے جاتا ہے۔ اور اُن کو برسا کر زراعت کو بار آور کرتا ہے۔ ایسے ہی وہ خیالات کو بلندی پر لے جا کر عالی دماغی اور روشن ضمیری پیدا کرے۔ جیسے آفتابِ نور افشاں فوٹوگراف کی حسین تصویریں اُتارتا ہے۔ ایسے ہی وہ بھی سنگ دلوں میں نرم دلی کے جوہر پیدا کرے۔ اگر اس دعا کا کوئی حصّہ مقبولِ الٰہی ہو جائے گا۔ تو شمس کا کام بن جائے گا۔ اور اس کو ناکامی کا کسوف نہیں لگے گا۔"

(شمسِ بنگالہ۔ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۶-۲۷)

مولوی ذکاء اللہ کے اور مضامین بھی چھپے۔ مثلاً "قحط" جس میں ہندوستان کے اُس زمانے کے کال کا ذکر کرتے ہوئے "راج ترنگنی" سے ایک کہانی لے کر درج کی گئی ہے۔ "انڈیا میں شہنشاہیٔ انگلشیہ"۔ جس کی پہلی قسط میں انڈین نیشنل کانگرس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ یہ نیشنل جماعت نہیں۔ کیونکہ مسلمان اس سے الگ ہیں۔ اس کے بعد بتایا کہ یہ جماعت کس طرح ابتدا۔

میں تمدنی تھی ۔ پھر سیاسی بنی ۔ اور اس کے بعد اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں میں ٹھن گئی ۔ آپ نے انتہا پسندی کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کانگریس کی بائیس تیئس سال کی جانفشانی خاک میں مل جائے گی تقسیم بنگال پر ایک طویل مضمون چالیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس میں تقسیم بنگال کے فوائد بیان کرتے ہوئے بنگالی ہندوؤں کی اس تحریک کی مذمت کی گئی ۔ جس کا مقصد یہ تھا ۔ کہ بنگال پھر متحد ہو جائے آپ نے لکھا :-

"جب مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی سلطنت کا عروج تھا ۔ تو اُن کے دارالسلطنت ڈھاکہ کی شان و شکوہ کا ستارہ چمکتا تھا ۔ بعد ازاں اس کا ایسا زوال آیا کہ اس کے حال پر کبھی وہ توجہ نہیں کی گئی جس کا وہ مستحق تھا ۔ اب حکام نے اس کی پہلی حق تلفی کی مکافات کی کہ ایک نیا صوبہ بنا کے اس کا دارالسلطنت اس کو بنایا ہے ۔ ہندو بنگالی اس دارالسلطنت بنانے کو سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے فائدہ پہنچانے کے لیے بنایا گیا ہے ۔ وہ گورنمنٹ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے مسلمانوں پر بے جا عنایت اور مہربانی کر کے اپنی اس نیکی کو خاک میں ملایا ہے کہ وہ کسی مذہب کی طرف دار نہیں ۔ وہ کل مذاہب کو اپنے میزانِ عدل میں برابر تولتی ہے ۔ اب اُس نے مسلمانوں کی خوشی کی جو تعداد میں ایک کروڑ اسی لاکھ تھے ۔ اور ہندوؤں کی دل شکنی کی جو تعداد میں دو کروڑ چالیس لاکھ تھے ۔ مسلمانوں نے بلا اتفاق اس تقسیم پر خوشی کے شادیانے بجائے ۔ اور ہندوؤں نے ماتم کے نعرے مارے ۔ یہ مسلمان کچھ وقعت اور عزت نہیں رکھتے تھے ۔ کبھی انھوں نے اپنی آپ مدد کرنے کا سبق

نہیں پڑھا۔ کوئی کالج اور اسکول اپنی تعلیم کے لئے قائم نہیں کیا۔ ان کے پاس سرمایۂ دولت ہے نہ علم ہے۔ نہایت ذلت اور خواری کی حالت میں وہ رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے اپنی آپ دوا کرنے میں بڑی کوشش کی۔ اپنی تعلیم کے لئے اپنی گرہ سے اسکول اور کالج قائم کئے۔ اپنے تئیں تعلیم یافتہ بنایا۔ دولت پیدا کی۔ مسلمانوں کی خاطر کرنی اور ہندوؤں کی دل شکنی کرنی ایسی ہی ہے۔ کہ کوئی اشراف کا دل توڑ کے اجلاف کا دل خوش کرے" دبشمس۔ اکتوبر، ۱۹۰۸ صفحہ ۵۸-۵۹)

دسمبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں" مولوی ابوالکلام آزاد دہلوی" کا ایک مضمون چھپا۔ لیکن یہ صفحات فائل سے حذف ہو چکے ہیں اور فہرست مضامین میں جہاں اس کا عنوان درج تھا۔ وہ حصہ پھٹا ہوا ہے۔ منشی نوبت رائے نظر لکھنوی نے "آخری شاہ اودھ" کے عنوان سے ایک طویل مقالے میں واجد علی شاہ کے حالات پر روشنی ڈالی۔ یہ مقالہ اقساط میں چھپتا رہا۔ مولوی رضا علی وحشت نے " غصہ اور اس کے نتائج" پر مضمون لکھا۔ مولوی تفضل حسین فطرت نے " افلاسِ ہند" پر ایک سلسلۂ مضامین قلمبند کیا۔ آغا رفیق بلند شہری کے تاریخی مضامین درج ہیں۔ مولوی سید علی سجاد عظیم آبادی کا ایک ناول " پھولوں کی ڈالی" مسلسل چھپتا رہا۔ مولوی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگِ آصفیہ نے "کھیت کی سیر اور کیلی بارہ کی لہر" کے عنوان سے ایک نہایت خوبصورت مضمون دیا ہے۔ پہلی چند سطور سے زبان کی سادگی اور حسن کا اندازہ کیجئے:

"منگسر یعنی نومبر کا مہینہ ہے۔ مرچوں کا کھیت کھڑا لہرا رہا ہے۔ کسانیاں کھیت نلاتی اور اڑاہا اکھاڑ اکھاڑ کر پھینکتی جاتی ہیں۔ کسان پانی

بُلا رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پودوں میں ہری ہری مرچیں سبز آویزوں کی طرح لٹک رہی ہیں۔ کسی درخت میں زرد ہو گئی ہیں۔ کسی میں آدھی زرد، آدھی سُرخ ہیں۔ کسی میں کچھ سبز اور کچھ سُرخ کسی میں تینوں رنگ کی بہار دکھا رہی ہیں۔ مرچوں کے پیڑ رنگ برنگ کے بُندے کانوں میں ڈالے، پتّوں کا سہرا باندھے، دولہا بنے، طرّہ لٹکائے کھڑے ہیں۔" (اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۷۶)

اس کے بعد کنوئیں کے بہت سے گیت درج ہیں۔ جن میں سے دو ذیل میں دیئے جاتے ہیں۔

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے

دو پاٹن بیچ آئے کے ثابت گیا نہ کوئے

کبیر داس چلتی ہوئی چکّی دیکھ کر رو دیا۔ اور کہا کہ سچ ہے کہ آسمان زمین کے دو پاٹوں میں آ کر کوئی صحیح سلامت اور قائم نہیں رہا۔

تُلسی بروا باگ کے سینچت بھی کملائیں

رام بھروسے جو رہیں پربت پر ہریائیں

تلسی داس کہتا ہے۔ باغ کے درخت پانی دینے پر بھی اکثر کُملا جاتے ہیں مگر خدا کی قدرت دیکھو جو اُس کے بھروسے پر رہتے ہیں وہ سوکھے پہاڑوں پر بھی لہلہاتے ہوئے اور سرسبز نظر آتے ہیں۔"

"ساون کے گیت" کے عنوان سے حامد حسن قادری نے چند لوک گیت درج کیے ہیں۔ ان میں سے چند بول ملاحظہ ہوں:-

کوئی پی سے کہو آؤ برسات بھی آئی ہے
برسات کے موسم نے کیا آگ لگائی ہے

پاپی رے پپیہے!
تو نے کیا پی کی سنائی
ایک آگ لگائی
کوئی کہو جا اُن سے
کچھ سُدھ بھی ہماری ہے
دروازے لگیں آنکھیں
دھیان ہے آہٹ میں
نا نیند ہے آنکھوں میں
نا چین ہے کروٹ میں
کوئی کہو جا اُن سے
کچھ سُدھ بھی ہماری ہے

اُٹھی پورب سے گھٹا
جیارا ڈرائے سکھی
پی نہ گھر آئے سکھی
باغوں بیچ بولے ہے کویلیا
بن میں بولے ہے مور
دادر اکرتا ہے شور
اس کے شوروں سے مری جان نکل جائے سکھی

دوسرے مضمون نگاروں اور شعرا میں سے چند کے نام یہ ہیں:
شمس العلما مولوی محمد یوسف جعفری رنجور۔ عبدالکریم نشتر۔ امجد حسین شوق لکھنوی۔ عبدالرحمٰن بسمل بہاری جتی نعمانی۔ قاضی عبدالمجید حمید۔ درگا سہائے سرور جہاں آبادی۔ محمد محسن فاروقی۔ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔ شاد عظیم آبادی۔ مولوی سلطان احمد جالندھر۔ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی۔ مولوی نذیر احمد۔ خواجہ حسن نظامی۔ منشی ڈپٹی لال نگم۔ محمد یحییٰ تنہا۔ میرزا احمد شاہ گورگانی۔

۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں جو نئے اردو رسالے نکلے۔ ان کے بارے میں بھی تفاصیل ملتی ہیں جن کا ملخص یہ ہے:

۱۔ ماہنامہ "ترقی" پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور کا رسالہ جس میں سائنس اور تاریخ پر مضامین خصوصیت سے شائع ہوتے تھے۔ ہر اشاعت بہتر صفحات پر مشتمل ہوتی تھی۔

۲۔ ماہنامہ "صحیفہ" (حیدرآباد دکن)۔ انجمن معارف کا علمی، اخلاقی، تاریخی، تمدنی اور ادبی رسالہ۔ عملۂ ادارت میں گریجویٹوں کی ایک جماعت شامل تھی ایک فرانسیسی ناول کا ترجمہ بالاقساط چھپتا تھا۔ صفحات باون۔

۳۔ ماہنامہ "زبان"۔ دلّی کی ٹکسالی زبان میں شائع ہونے والا اور اردو علم و ادب کی دلچسپیوں کا حامل۔ تہذیب و تنظیم نسواں کا پورا معاون۔ حجم ۴۸ سے ۶۴ صفحات تک۔ تصاویر بھی چھاپتا تھا۔

۴۔ پندرہ روزہ "ناصر الاخبار" (میرٹھ): ہر قسم کے مفید عام مضامین درج ہوتے تھے۔ اولیا اور صوفیا کے حالات خصوصیت سے چھاپے جاتے تھے۔

۵۔ ماہ نامہ " العزیز " (آگرہ) : عبدالرؤف ہاتف کی ادارت میں نکلتا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں ہندوستان میں والیٔ افغانستان کی آمد پر "امیر نمبر" نکالا اور ۱۹۰۸ء میں "زنانہ نمبر" جس میں سارے مضامین عورتوں کے بارے میں تھے۔ عورتوں کی بے شمار تصاویر چھاپی گئیں۔

۶۔ ماہنامہ "ید بیضا" سکندر آباد : حکیم محمد سعید خنجر کی ادارت میں نکلتا تھا۔ نامہ نگاروں میں اکثر گریجویٹ تھے۔

۷۔ ماہ نامہ "آزاد" لاہور : بشن سہائے آزاد کی ادارت میں نکلتا تھا۔ زیادہ تر رنگ سیاسی تھا۔ ۱۹۰۷ء میں کانگرس نمبر نکالا۔ لالہ لاجپت رائے کا افسانہ "برہا" بالاقساط چھپنے لگا۔ اس رسالے کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس کے بعض مضامین کے تراجم امریکہ کے اخباروں نے چھاپے۔

۸۔ پندرہ روزہ "الکیمیا" مالیر کوٹلہ : "جس کا اہم مقصد طبی و کیمیائی مضامین کی اشاعت ہے۔ اس قسم کا شاید یہ ایک ہی اخبار ہے جو ہندوستان سے اردو زبان میں شائع ہوتا ہے۔" (مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۹۳)

۹۔ ماہ نامہ "المجدد" لاہور : حضرت مجدد الف ثانی رح کی یاد میں نکالا گیا پہلے شمارے میں مولوی ذکاء اللہ کا مضمون چھپا۔ ایڈیٹر کا نام تاج الدین تلرج تھا۔

ظفر علی خاں کی صحافت کا آغاز

کون نہیں جانتا کہ مولانا ظفر علی خاں نے اردو صحافت کی نشاۃ ثانیہ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ عوام میں اخبار بینی کا ذوق پیدا کیا اور صحافت کے ذریعے سے سامراج کے خلاف عوامی جدوجہد کے لئے زمین تیار کی۔ یہ درست ہے کہ اُن کے صحافتی جوہر "زمیندار" اور "ستارۂ صبح" میں چمکے۔ لیکن ان کی صحافتی زندگی کا آغاز کیونکر ہوا؟ اس بارے میں مولانا ظفر علی خاں کے سوانح نگار اوّل تو خاموش ہیں اور اگر انھوں نے کچھ لکھا ہے تو وہ بے حد مبہم ہے۔

جب اُنیسویں صدی دم توڑ رہی تھی۔ ظفر علی خاں کاکلِ ادب کی آرائش میں مگن تھے۔ حیدرآباد دکن کے سازگار علمی ماحول میں انھوں نے دارالترجمہ کی ملازمت کے دوران پہلے شبلی کی معرکۃ الآرا تصنیف "الفاروق" کو انگریزی میں منتقل کیا۔ اور اسی زبان میں "لائف آف سر سید احمد خاں" کے نام سے ایک کتابچہ لکھا۔ پھر رائیڈ ہیگرڈ، رینلڈ، رڈیارڈ کپلنگ اور ایڈگر ایلن پو کے شاہکاروں کو اردو میں ترجمہ کرکے اہلِ علم سے

خراجِ عقیدت حاصل کیا۔ پھر لارڈ کرزن کی کتاب "گارڈن آف پرشیا" کو "خیابانِ فارس" کے روپ میں پیش کیا۔ اور "جنگِ روس و جاپان" کے نام سے ایک طبعزاد ڈراما لکھ کر ثابت کیا کہ سیاست بھی اردو ڈرامے کا کا موضوع بن سکتی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور سے سرشیخ عبدالقادر کی ادارت میں "مخزن" جاری تھا۔ لکھنؤ سے عبدالحلیم شررؔ "دلگداز" نکالتے تھے۔ علی گڑھ سے حسرتؔ موہانی کا "اردوئے معلیٰ" جاری تھا۔ اور حیدرآباد دکن میں رسالہ "حسن" بند ہو جانے سے ادبی صحافت کی بساط اُلٹ چکی تھی۔ ۱۹۰۲ء میں مولانا ظفرعلی خاں نے وہیں سے ایک چھوٹا سا ماہ نامہ "افسانہ" کے نام سے جاری کیا۔ جس میں رینلڈز کا مشہور ناول "مسٹریز آف لنڈن" "فسانۂ لندن" کے نام سے بالاقساط چھپتا تھا۔ بہرحال ایک سال کے اندر اندر مولانا کو احساس ہوا کہ وہ اس سے بہت بہتر کام کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں اُنھوں نے "دکن ریویو" کے نام سے ایک علمی و ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ جس نے بہت جلد برِعظیم کے نامور ادبا، اور شعرا، کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ جو لوگ اس میں باقاعدہ لکھتے تھے ان میں نواب نصیر حسین خیالؔ، شبلی نعمانی، اکبرالہٰ آبادی، مولوی عبدالحق۔ (جو بعد میں بابائے اردو کے نام سے مشہور ہوئے)، رضا علی وحشتؔ، سید علی حیدر طباطبائی، سرکشن پرشاد شادؔ، مرزا محمد ہادی عزیزؔ، سید فضل حق آزادؔ عظیم آبادی، سید کاظم حسین شیفتہؔ۔ نواب عزیز جنگ بہادر، مولوی منظور حسن اور مولوی معشوق حسین خاں شامل تھے۔ دو سال تک یہ رسالہ جاری رہا۔ پھر حیدرآباد کی ملازمت اچانک ختم ہوگئی تو مولانا بمبئی چلے گئے اور میر محفوظ علی بدایونی کی رفاقت میں ایک تجارتی ادارہ قائم کیا جو غیر ممالک سے ہاتھی دانت

کا سامان اور ریشم درآمد کرتا تھا۔ اسی سلسلے میں مولانا سومالی لینڈ گئے اور سات مہینے کے بعد لوٹے۔ یہ تجارت مفید نہ ثابت ہوئی بلکہ خسارہ ہوا چنانچہ انھوں نے تجارت چھوڑی اور "دکن ریویو" بمبئی سے جاری کرلیا۔ دو تین پرچے نکلے تھے کہ دکن میں حالات پھر سازگار ہو گئے۔ اور مولانا پھر وہیں چلے گئے۔ سرکاری ملازمت پھر مل گئی۔ اور مولانا نے "دکن ریویو" کا سلسلۂ جدید شروع کیا اور یہ رسالہ پھر اپنے پرانے ٹھاٹھ سے نکلنے لگا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے آمدنی تو درکنار، خاصا خسارہ ہوتا تھا۔ چونکہ ادب کی خدمت کا شوق تھا۔ اس لئے نقصان برداشت کرتے چلے گئے۔ یہی نہیں نقصان کے باوجود مقالہ نگاروں سے معاوضے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اگرچہ دکن ریویو کے علمی سرپرستوں کی نوازشات کا سلسلہ اُس ارادت کی طرح، جو ہمیں اُن کی جناب میں ہے۔ لامتناہی ہے۔ پھر بھی اس عرق ریزی اور جاں کاہی کا اندازہ کرکے جو ایک اچھے مضمون کے لکھنے میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ بارِ شاطر ہونے کے بجائے ہم اپنے تقاضوں کے باعث ان کے لئے بارِ خاطر ہوں۔ پس آئندہ سے دکن ریویو کے قلمی معاونین کو یہ اطلاع دینا ہم اپنا فرض خیال کرتے ہیں کہ جو مضمون اس کے کالموں میں شائع ہوگا۔ اس کا معاوضہ بجائے خالی خولی زبانی شکریہ کے نقدی میں دیا جائے گا۔

(فروری، ۱۹۰۹ء)

لیکن اگلے مہینے حالات نے ایک ایسی کروٹ لی کہ مولانا کے سارے عزائم مٹی میں مل گئے۔ آپ نے رسالے میں اعلان کیا کہ میں اس کی

ادارت اور ملکیت سے الگ ہوتا ہوں۔ آئندہ مالک و مدیر مولوی سید مودود احمد قادری ہوں گے۔ اور وہ "دکن ریویو" کی قدیم پالیسی کو جاری رکھیں گے۔ علیحدگی کے سلسلے میں آپ نے جو طویل مضمون لکھا۔ اس کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں :

" دکن ریویو کو معرض وجود میں آئے ہوئے کچھ اُوپر پانچ سال ہوئے ہیں اور جو کچھ بُری بھلی خدمت اردو زبان کی اس سے ہو سکی، اس نے انجام دی۔ شکر ہے کہ ملک نے اس کی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اس عرصہ میں اس کو طرح طرح کی مشکلات اور عوارض کا سامنا ہوا۔ کبھی یہ تاخیرِ اشاعت کے مرض میں مبتلا ہوا کبھی اس نے چار چار پانچ پانچ نمبر ایک ساتھ نکالے۔ ایک دفعہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ بوجہ ہماری علالت اور ہندوستان سے باہر چلے جانے کے ہمیں اس کی اشاعت سات آٹھ مہینے تک ملتوی کردینی پڑی۔ لیکن باوجود ان تمام اہتمام اور عیوب اور لغزشوں کے اس کے قدردان ناظرین نے اِسے اپنا مطمح نظر بنائے رکھا۔ ہمیں بھی ان تمام خرابیوں کے باوجود یہ یقین تھا کہ "دکن ریویو ایک زندہ اور ہمیشہ سرسبز رہنے والی تحریک ہے۔ جو کبھی نہیں مٹ سکتی۔ اور جو قبر تک ہمارے ساتھ جائے گی۔ اس لئے ہم نے اُن تمام نقصانات کو جو ہمیں اس کی وجہ سے علی الاتصال برداشت کرنے پڑے۔ ماتھے پر بل لائے بغیر اُٹھایا۔ ہم نے اپنا اور اپنے بال بچّوں کا پیٹ کاٹا۔ لیکن اس کا رُخ بھرا۔ آئینہ میں ہمیں اپنی پریشان اور متوحش صورت ہر روز دیکھنی پڑی۔ لیکن یہ ہم نے کبھی گوارا نہ کیا کہ اس کے سرورق

کی زیبائش اور رعنائی اس تصویر کے نہ ہونے سے کم ہو جائے۔ جو ہر پرچے میں ناظرین کو ہدیتہً پیش کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ کس لئے تھا؟ محض اس لئے کہ ہمیں اس کے ساتھ محبت تھی اور ہم نے عہد کر لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو، اسے اسی شان کے ساتھ برابر نکالے جائیں گے۔ لیکن سرِ دست رباعی بفسخ العزائم ہم نہایت دلی رنج کے ساتھ بلا کسی مزید تمہید کے ناظرین کو یہ اندوہ ناک خبر سناتے ہیں کہ یہ پرچہ دکن ریویو کا آخری نمبر ہے۔ جس کی ایڈیٹری کی خدمت ہم انجام دیتے ہیں۔ جس چیز نے ہمیں "دکن ریویو" سے تعلق ایڈیٹری قطع کرنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ سرمایہ کی کمی نہیں ہے بلکہ وقت کی کمی ہے۔ (مارچ ۱۹۰۹ء)

اس کے بعد مولانا نے بیان کیا کہ پہلے سرکاری مشاغل ایسے تھے کہ بہت وقت مل جاتا تھا۔ دوسرے "جسمانی اور دماغی توانائی کا وفور" مددگار تھا۔ اب ایک طرف سرکاری خدمت کی نوعیت ایسی ہو گئی ہے کہ وقت نہیں ملے گا۔ دوسرے اب وہ "شگفتہ صحت" باقی نہیں رہی۔ بلکہ زندگی "مضمحل اور پژمردہ" ہے۔ اصل وجوہ وہ نہیں تھیں جو مولانا نے بیان کیں۔ اصل وجوہ کے بیان میں مصالح حائل تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ دکن کی محلاتی سیاست نے ایک ایسا رُخ پلٹا کہ مولانا کو معلوم ہو گیا کہ وہ بہت جلد نکالے جائیں گے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ رقص و سرود کی ایک محفل میں اُن سے کہا گیا کہ وہ فن کاروں کا شکریہ ادا کریں۔ چونکہ وہ اس ثقافتی شو کو شعائرِ اسلامی کے منافی سمجھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی روایتی بے باکی سے کام لیتے ہوئے سرِ محفل اس کی مذمت کر ڈالی۔ دوسرے کچھ بڑے

لوگوں نے انگریز ریزیڈنٹ کے کان میں یہ بات ڈالی کہ مولانا ظفر علی خاں سید جمال الدین افغانی کی تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ ایسی سازش میں مصروف ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ میر محبوب علی خاں نظام دکن کو گدی سے اتار کر میر عثمان علی خاں کو بٹھا دیا جائے۔ اور ریاست انگریزوں سے ناطہ توڑے۔ چنانچہ مولانا زیرِ عتاب آگئے۔ اور ایک دن بارگاہِ خسروی سے اچانک حکم صادر ہوا۔ کہ ظفر علی خاں، عبدالحلیم شرر۔ اور مولوی عزیز مرزا چوبیس گھنٹے کے اندر اندر حدود ریاست سے باہر نکل جائیں۔ چونکہ مولانا کو حکمران طبقے کی ریشہ دوانیوں کا علم تھا اس لئے انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ "دکن ریویو" کسی اور کے سپرد کر دیا جائے۔ تاکہ جب اخراج کا وقت آئے تو کم از کم اس بلا سے تو نجات پا چکے ہوں۔ اگلے مہینے نئی ادارت میں رسالہ نکلا اور نئے مدیر نے مولانا کو خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے لکھا:

"بجز اس کے کہ ایک مرتّب کا نام بدل گیا۔ کوئی اور تغیر اس میں واقع نہیں ہوا۔ ایک بہت بڑے فرزانۂ روزگار کا قول ہے کہ گلاب کے پھول کا نام بدل کر چاہے کوئی دوسرا نام لیا جائے پھر بھی اس کی آنکھوں میں کھب جانے والی خوش رنگی اور اس کی بھینی بھینی مہک کی مشام افروزی وہی رہے گی۔ جو آگے تھی۔"

(مئی، ۱۹۰۹ء)

دو تین مہینے بعد ہی اخراج کا حکم آیا۔ اور مولانا کرم آباد کو لوٹے۔ جہاں اُن کے والد مولوی سراج الدین احمد بستر مرگ پر تھے۔ اور جب وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو "زمیندار" کی ادارت مولانا نے خود سنبھالی۔ اور یوں وہ اُس راستے پر گامزن ہوئے جس پر کانٹے ہی کانٹے تھے اور

سوائے ایک مختصر سے دور کے ساری عمر خارزار سیاست اُن کی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا ہے۔

"دکن ریویو" چھوٹے سائز کے باون صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ سرورق موٹے کاغذ کا ہوتا تھا۔ اور طباعت اور کتابت معیاری تھی۔ ہر پرچے میں آرٹ پیپر پر ایک عکسی تصویر دی جاتی تھی۔ سلسلۂ جدید کی پہلی جلد نومبر ۱۹۰۶ء کو شروع ہوئی اور اکتوبر ۱۹۰۷ء میں ختم ہوئی۔ ان بارہ شماروں کا کل حجم سات سو سولہ صفحات تھا۔ مضامین میں حیاتِ صلاح الدین، دنیا کا خاتمہ، خلفاء اور خلافت، تولہ بھر ریڈیم، العالم الاسلامی، زبانِ عرب اور دنیا پر اس کا اثر۔ معرفتِ نفس اور اسلامی خطرہ نمایاں تھے۔ اور جسٹس بدرالدین طیب جی، سر کریم بھائی ابراہیم، امیر حبیب اللہ خاں والئ افغانستان، خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید، شاہِ ایران اعلیٰ حضرت محمد علی شاہ، اور اعلیٰ حضرت مولائی عبدالعزیز کی تصاویر درج کی گئیں۔

نومبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں نواب محسن الملک کی وزارت پر مقالے اور مرثیے درج کیے گئے۔ ایک مقالہ مولوی عبدالحق کا بھی شامل ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے "نوحۂ مہدی" (نواب محسن الملک کا اصل نام مہدی علی تھا) لکھا۔ جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اے صدر بزمِ قوم کدھر ہے کہاں ہے تو
لے چل وہیں ہمیں بھی خدارا جہاں ہے تو
دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی
جس وقت سے ہماری نظر سے نہاں ہے تو

آثار ہیں جہاں میں قیامت کے آشکار
کیونکر نہ ہوں کہ مہدیٔ آخر زماں ہو تو
باغِ جناں میں آج سماں ہوگا دیدنی
سید کے گھر میں جا کے ہوا میہمان تو

اس شمارے میں اکبر الہ آبادی کا ترانۂ عید درج ہے۔ اور شبلی کی ایک فارسی غزل۔ اگلے شمارے میں مولانا نے بتایا کہ پچھلے بارہ مہینے میں اُنھیں بارہ سو روپے کا نقصان ہوا۔ آپ نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ بہت کم لوگ خریدار بنتے ہیں۔ آخر میں لکھا۔

"فسانۂ لندن کو البتہ ملک نے بہت پسند کیا ہے اور ہم سے تقاضا کیا جا رہا ہے کہ جس طرح بن پڑے۔ اس کی اشاعت کی فکر کی جائے۔ اس کی صرف ایک تدبیر ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ رسالہ افسانہ پھر جاری کیا جائے۔ لیکن اڑتالیس صفحے کے ہفتہ وار میگزین کی شکل میں۔ جس کے ذریعہ سے فسانۂ لندن (رینالڈز کی دلآویز تصنیف مسٹریز آف لندن کا ترجمہ) ایک ہی سال میں ناظرین تک پہنچ جائے اور اس کے بعد کوئی دوسرا دلچسپ قصّہ شروع کیا جائے۔ اس میگزین کے چار صفحے علمی خبروں اور دلچسپ باتوں کے لئے علٰحدہ کر دیئے جائیں گے۔"

اس کے بعد چندہ خریداری بتا کر مولانا نے اعلان کیا۔ کہ جس وقت خریداری کے لئے ایک ہزار درخواستیں آ جائیں گی۔ رسالہ جاری کر دیا جائیگا غالباً اتنی درخواستیں نہ آئیں۔ اس لئے رسالہ "افسانہ" کا اجرا نہ ہو سکا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ مولانا زندہ ناچ گانے کے مخالف تھے۔ لیکن سینما پر اُنھیں زیادہ اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ چندہ جمع کرنے کے لئے فلم کی نمائش کو مستحسن سمجھتے

تھے۔ جب علی گڑھ زنانہ نارمل سکول کے لئے چندے کی ضرورت پڑی تو مولانا اور اُن کے احباب نے ۱۲ر نومبر ۱۹۰۷ء کو رائل بائی سکوپ کمپنی بمبئی کے زیر اہتمام ایک فلم شو کرایا۔ آخر میں انھوں نے ایک تقریر میں تھیٹر میں مسلمانوں کی دلچسپی اور اس کے ذریعے سے چندے کی فراہمی کے بارے میں جو دلچسپ باتیں کیں۔ اُن کا ایک اقتباس یہ ہے۔

"جدید تمدن، جس نے ظاہر پرستی کے فن میں خاص طور سے عَلمِ امتیاز بلند کیا ہے۔ جب اپنے نظر فریب اور دل فریب اور دل رُبا ساز و سامان کو تھیٹروں کی ہوش ربا جلوہ نمائیوں اور متحرک تصویروں کی کرشمہ سنجیوں اور فونوگراف (گراموفون) کی سحر سازیوں کی شکل میں لئے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوا۔ تو اُن نکتہ رس اور دقیقہ سنج طبیعتوں کو، جو دردِ دل سے مجبور ہو کر کسی نہ کسی طرح اپنے ابنائے وطن کو تنزل سے نکال کر بامِ رفعت پر پہنچانے کی آرزو مند تھیں۔ اس میں بھی اپنے ڈھب کی ایک بات سُوجھ گئی۔ مسلمانوں کی وارفتہ مزاجی اور عشرت پسندی تو ظاہر ہی ہے۔ پلے ٹکا نہ ہو۔ لیکن یہ بزرگوار بی بی کی ناک کی نتھ بیچ کر تھیٹر کا تماشا دیکھنے کے لئے ٹکٹ ضرور خریدیں گے۔ گھر میں کھانے کو نہ ہو۔ لیکن آپ قرض دام لے کر فوٹوگراف ضرور لیں گے۔ اور حضرت ایڈیسن علیہ ما علیہ کے گنج قارون میں زیادہ نہیں تو بہ قدر پچاس ہی روپے کے اضافہ ضرور فرما سکیں گے۔ ان کے اس رجحانِ طبع کو قوم کے لئے مفید بنانا اگرچہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ لیکن چندہ والوں کی جرت طرازیوں کے آگے اس کی ایک پیش نہ گئی۔"

اسی محفل میں مولانا نے پردے پر بھی اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔ اور چشمِ تصوّر سے پردے کی رسم ختم ہونے کے جو نتائج دیکھے وہ بے انتہا خطرناک تھے۔ الحمدللہ کہ وہ نتائج رُونما نہیں ہوئے۔ بہرحال یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ کہ آج سے چھپّن سال پہلے ایک مُصلحِ قوم نے مستقبل کو کس رنگ میں دیکھا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"ان باتوں میں بھی اگر تم نے مغرب کی تقلید کی تو کوئی دن جاتا ہے کہ مشرق کے دریاؤں کی تہ ایسے بہت سے بے زبان اور ناکردہ گناہ بچوں کا گہوارہ بن جائے گی۔ جنھیں اُن کی ناخداترس ماؤں نے اپنی شہرتِ دوشیزگی برقرار رکھنے کے لئے موجِ آب کے حوالے کردیا ہوگا۔ مشرق کے شہروں کی محفلوں میں کثرت سے ایسے اشخاص نظر آئیں گے۔ جن کا نام نسبتِ ابوّت کا شرمندۂ احسان نہ ہوگا۔ ازدواج اور خانگی تعلقات کو آزادی کا سنگِ راہ سمجھ کر اکراہ و تنفّر کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ عدالتوں میں طلاق کے مقدمات کی وہ کثرت ہوگی کہ ججوں کو سر کھجانے کی فرصت نہ ملے گی۔ بچوں کا وجود ایسا نجس اور مکروہ سمجھا جائے گا کہ فرماں رواؤں کو اس ڈر کے مارے کہ کہیں نسلِ انسانی منقطع نہ ہوجائے۔ کثیرالاولادی کے لئے انعام اور تحفے مقرر کرنے پڑیں گے۔ مندر ویران، کلیسا برباد اور مسجدیں مسمار ہوجائیں گی۔ اور ان کے کھنڈروں پر ایک نیا معبد بنے گا۔ جس کا نام روپیہ ہوگا۔ اور حرص و خودغرضی و ریاکاری اس معبد کے پجاریوں کے مذہبی اُصول ہوں گے۔"

(دسمبر ۱۹۰۷ء)

اسی پرچے میں شبلی کی ایک فارسی غزل درج ہے۔ جو بہت پسند کی گئی اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

نثارِ بمبئی کن بر متاعِ کہنہ و نو را
طرازِ مسندِ جمشید و فرِ تاجِ خسرو را

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت
کنارِ آبِ چوپاٹی وگلگشتِ اپالو را

اسی سال مولانا عبدالحق (بابائے اردو) کی ایک کتاب "العلم الاسلامی" بالاقساط چھپتی رہی۔

دسمبر ۱۹۰۰ء کے "مخزن" میں شیخ عبدالقادر نے ایک افتتاحیے میں تجویز پیش کی کہ اردو سبھا کے نام سے اُن اشخاص کی ایک مجلس وہی خدمت انجام دے جو فرانس کی شہرۂ آفاق جماعت "اکادمی" سرانجام دیتی ہے مولانا ظفر علی خاں نے فروری ۱۹۰۱ء کے "دکن ریویو" میں اس کی پُر زور تائید کی لیکن ساتھ ہی کہا کہ اس کا نام کچھ اور رکھا جائے۔ کیونکہ اردو سبھا کے نام سے بادی النظر میں "اندر سبھا" کا دھوکا ہوتا ہے۔ مولانا کے اداریئے میں یہ انکشاف دلچسپی سے خالی نہیں کہ

"مشرقی بنگال میں بھی، جہاں کی عام بولی بنگالی ہے مسلمانوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اُن کی قومی زبان اردو ہوگی"۔

یاد رہے کہ اُس زمانے میں "مشرقی بنگال" ایک الگ صوبہ تھا۔ اور ۱۹۱۲ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ سے مشرقی بنگال پھر متحدہ بنگال کا جزو بنا۔ "دکن ریویو" کے جو شمارے مجھے دستیاب ہوئے۔ ان میں سے چند مضامین کے عنوان پیش کرتا ہوں۔ تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس مجلّے میں

کیسی چیزیں چھپتی تھیں :

ہندوؤں کی تہذیب

السفر وسیلۃ الظفر : (رتن ناتھ سرشار کا آخری نا مکمل مضمون)

عربی شاعری اور مثنوی

فنونِ لطیفہ (سنگ تراشی اور مصوری پر مقالے)

نامۂ روح

ہولی

قرونِ عالم

ایک طویل شذرے میں مولانا ظفر علی خاں نے اپنے والد سراج الدین احمد کے اخبار "زمیندار" کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح اُن کے دادا مولوی کرم الٰہی خاں نے ۱۸۸۴ء میں وزیر آباد سے دو میل دور زمین خرید کر اپنے نام پر کرم آباد کی بستی آباد کی اور اُن کے والد نے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر "زمیندار" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا اور بعد میں میاں محمد شفیع (جنھیں سر کا خطاب ملا) سے مل کر زمیندار ایسوسی ایشن قائم کی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ زمینداروں کی بھلائی کے کام کیے جائیں۔ "زمیندار" کے بارے میں مولانا نے یہ سطور لکھیں :

"اس شخص نے کمرِ ہمت چُست باندھ کر وہ کام اپنے ذمہ لیا جس کی مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہر قلس بھی ڈرتا۔ سب سے پہلے اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لحاظ سے اس نے ایک اخبار بنام زمیندار جاری کیا۔ اور اس کے ذریعہ سے اپنی آواز جو گم کردۂ راہ کارواں کے لئے بہ منزلہ بانگِ دراتھی،

زمینداروں تک پہنچانی شروع کی۔ یہ آواز اوّل اوّل بہت ہی دھیمی اور مدھم تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ بلند اور پاٹ دار ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ دشت وجبل اور وادی کوہسار اس سے گونج اُٹھے۔ اور ایک اخبار "زمیندار" نے چند سال کے عرصے میں وہ کام کیا۔ جو بڑی سے بڑی طاقت نے صدیوں سے انجام نہ دیا تھا۔ زمینداران پنجاب میں حرکت اور بیداری کے آثار پیدا ہوگئے۔ وہ اپنی حالت اور حیثیت اور وقعت سے آگاہ ہوگئے۔ وہ اُن حقوق کا جو مدت ہائے مدید سے یا تو نظرانداز ہوتے چلے آئے تھے یا پامال کئے جارہے تھے۔ مطالبہ کرنے لگے۔ ان میں شوقِ علم پیدا ہوگیا۔ ان میں قومی زندگی کی نشانیاں نظر آنے لگیں اور بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ ایک ادنیٰ کرشمہ اس نئی روح کا جو اس اخبار نے زمینداروں میں بلالحاظ مذہب وملت (اور یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے) پھونک دی، یہ تھا قانونِ نوآبادی ہائے پنجاب جسے انھوں نے اپنے لئے مضر سمجھا تھا۔ علیٰ رغم الف مخالفین، لارڈ منٹو کی عنایت سے نافذ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ (مارچ و اپریل ۱۹۰۸)

"ستارۂ صبح" کی ایک جھلک

جب مولانا ظفر علی خاں نے اپنے والد مولوی سراج الدین احمد کی وفات پر ہفت روزہ "زمیندار" کی ادارت سنبھالی۔ تو یہ اخبار اپنی روایت کے مطابق ایک نہایت ہی معتدل روش پر گامزن تھا۔ اتنے میں پے در پے ایسے واقعات ہوئے جن سے برِعظیم کے مسلمانوں کا سینہ چھلنی ہوگیا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ، حادثۂ کانپور، جنگِ طرابلس، اور جنگِ بلقان نے جہاں "زمیندار" کو ایک پُرجوش اور طوفانی صحافت کا نقیب بنا دیا۔ وہاں لیلائے سیاست نے اُنھیں اس عشوہ و ادا سے اپنی طرف کھینچا۔ کہ وہ اُسی کے ہو رہے۔ اُسی کے بطن سے خطابت نے جنم لیا۔ اور بستی بستی اور نگر نگر میں اُن کی شعلہ مقالی کا چرچا ہوا۔ لیکن خطابت ادارہ نگاری کے لئے سمّ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ خطابت میں وقت کی قید دامن گیر نہیں ہوتی۔ بیان کو طول دیا جاتا ہے۔ کہ کسی لذیذ حکایت کو دراز تر کرنے سے لطف دوآتشہ ہو جاتا ہے۔ الفاظ کی پھلجھڑیاں بکھرتی ہیں۔ لطائف وظرائف کے انار چھٹتے ہیں۔ اور اشعار کی قندیلیں روشن

ہوتی ہیں ۔ لیکن اداریہ نگاری کے لئے ضروری ہے کہ ایک مخصوص موضوع کے اندر رہ کر ہر بات نہایت نپے تُلے انداز میں، کم از کم الفاظ میں اور منطق کے سہارے کہی جائے ۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خاں کی خطابت اُن کی اداریہ نگاری میں حائل ہو گئی وہ اداریئے کم لکھنے لگے اور اس کمی کو یوں پورا کیا کہ شاعری میں اپنے کمال کا رُخ صحافتی اور طنزیہ شاعری کی طرف موڑ دیا اور ایسے ایسے شہپارے تخلیق کئے کہ آج تک ہمارے کانوں میں اُن کی آواز گونجتی ہے ۔

پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا ۔ تو برعظیم میں سیاست کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا گیا ۔ مولانا ظفر علی خاں انگلستان میں پریس ایکٹ کے خلاف آواز بلند کرنے کے بعد وطن کو لوٹے ۔ تو اُنھیں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا ۔ سچ پوچھئے تو نظر بندی کا یہ دور علم وادب کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا کیونکہ مولانا نے لیلائے سیاست سے کنارہ کش ہو کر لیلائے علم وادب سے پیار کی پینگیں بڑھائیں ۔ اسی پیار نے " ستارۂ صبح " کو جنم دیا ، جو ۱۹۱۷ء کے آغاز میں ایک غیر سیاسی ہفت روزہ کی حیثیت سے کرم آباد سے جاری ہوا ۔ اسی سال ۲۳ ؍ مئی کو مولانا اپنے باغ میں ٹہل رہے تھے ۔ اور بہتر ہے انہی کی زبانی سنیئے :

" روش کے دونوں طرف گل ویاسمن کا ہجوم تھا ۔ انگوروں کی بیلیں زمردّین خلعت پہنے منڈیر پر لیٹی ہوئی تھیں ۔ نارنج کی پھلوں سے لدی ہوئی شاخیں نگاہ کو بے اختیار اپنی طرف کھینچنے میں مصروف تھیں ۔ ہوا میں ایک مستی انگیز کیفیت تھی ۔ اس لئے کہ کئی دن سے ابرِ آزاد کے جاں بخش چھینٹوں نے تابستان میں گلابی

جاڑے کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ ہم بے اختیار مرزا غالب کے یہ اشعار گنگنا رہے تھے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اتنے میں ایک دیوانے کتّے نے مولانا کی ایڑی پر کاٹا۔ اُسی وقت سر مائیکل اوڈوائیر گورنر پنجاب کو برقیہ بھیجا گیا۔ دو گھنٹے میں جواب آگیا کہ مولانا کو کسولی کے مرکزِ سگ گزیدگان میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔ وہیں سر اوڈوائر سے نامہ و پیام شروع ہوا۔ انھوں نے شملہ بلایا اور باہمی گفت و شنید کے بعد حکومت نے اعلان کیا کہ موصوف لاہور سے روزنامہ "ستارۂ صبح" جاری کر سکتے ہیں۔ اور مولانا نے ایک بیان میں سیاست کو "دور از کار" قرار دیتے ہوئے محض علم و ادب کی خدمت اور مفلوک الحال عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اپنی تحریروں کو تعمیری سرگرمیوں کے دائرے میں محدود رکھنے کا وعدہ کیا۔ اور اس طرح ۸ر اگست ۱۹۱۷ء کو روزنامہ "ستارۂ صبح" افقِ صحافت پر جلوہ افروز ہوا۔ اور مولانا نے لکھا:

"تقدیر نے اپنے نہاں خانہ میں سبب و مسبب کی جو آہنیں زنجیر ہمارے لیئے تیار کر رکھی تھی۔ اس کا پہلا حلقہ وہ دیوانہ کُتّا تھا۔ جس نے ہمیں کاٹا اور آخری حلقہ ستارۂ صبح کا یہ روزانہ نمبر ہے جو ناظرین کرام کے ملاحظہ سے گذر رہا ہے ع

اس مُبتدا کی دیکھیئے نکلے خبر کہاں"

مولانا کے مخالفوں نے سگ گزیدگی کو محض افسانہ قرار دیتے ہوئے اُن پر بے شمار اعتراض جڑ دیئے۔ اس پر آپ نے لکھا:

"کوئی کہتا ہے کہ ہم نے حکومت کے عطیۂ آزادی کے منظور کرنے سے ایک بہت بڑا قومی جرم کیا ہے۔ اور سیاسیات کو دُور از کار کہنا ایک اتنا بڑا گناہ ہے جس کے کفارہ کی توفیق ہمیں کبھی نہ بخشی جا سکے گی۔ کسی کا بیان ہے کہ ملک و ملت کی استخواں فروشی کے لیے حکومت کے ساتھ ہماری ایک خاص قسم کی مفاہمت ہو گئی ہے۔ کسی کا یہ خیال ہے کہ اس مفاہمت کے معاوضہ میں ہمیں ارباب حل و عقد کی طرف سے ایک گراں مایہ رقم چپ چپاتے دے دی گئی ہے کوئی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ زمینداروں اور غریبوں کی اصلاح کا ادعا ایک دھوکے کی ٹٹی ہے ـــ غرض اس قسم کی ہزاروں غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ہماری نسبت ہمارے نہایت ہی عزیز اور مخلص ہم قلموں اور ہم چشموں کی طرف سے طول و عرضِ ملک میں پھیلائی جا رہی ہیں۔ ہم ان کرم فرماؤں کے اس گوناگوں اور بوقلموں حُسنِ ظن کا جواب سوائے اس کے اور کیا عرض کر سکتے ہیں کہ یہ عالم بالا، کی 'شعر فہمی' کا ایک اندازِ خصوصی ہے۔"

پہلے شمارے کے ایک اداریئے میں مولانا ظفر علی خاں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ دہقانوں کی حالت کو بہتر بنا کر ہی ملک کی مجموعی بہتری کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے راعی و رعایا کے درمیان تعاون ضروری ہے۔ اس اداریئے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"حیاتِ ملّی کا اصلی نمائندہ وہ میلا سا تہمد باندھنے والا دہقان ہے۔ جسے نہ کڑکڑاتے جاڑوں میں چین ہے اور نہ جھلسانے والی لوؤں میں آرام۔ مینہ برسے اولے پڑیں۔ آندھی آئے۔ جھکّڑ چلیں، اُسے اپنے کام سے کام ہے۔ وہ اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے اور سلطنت کا خزانہ بھرتا ہے۔ وہ اگر نہ ہو تو نہ یہ لیگیں ہوں اور نہ یہ کانگریسیں۔ نہ یہ محل ہوں، نہ یہ مینار۔ دولت جو دین کے بعد خدا کی سب سے بڑی دین ہے اُسی کے مائدۂ فیض کا ایک ریزہ ہے۔ جسے چننے کے لئے پادشاہ و امیر، عالم و فاضل، مفتی و فقیہہ، سب دوڑے پڑتے ہیں۔

"وقت آگیا ہے کہ تمام شکوک و شبہات جو حاکم و محکوم کو ایک دوسرے سے جدا کئے ہوئے تھے۔ اُٹھ جائیں۔

"وقت آگیا ہے کہ ایک نیا عہد و پیمان راعی و رعایا کے گہرے تعلقات کی تجدید کرے۔ جس سے اس ملک کی قومیت کا بکھرا ہوا شیرازہ بندھ جائے۔

"وقت آگیا ہے کہ وہ لازوال دولتیں، جن سے کشورِ ہندوستان کا چپّہ چپّہ پٹا پڑا ہے۔ زمین سے باہر نکل آئیں۔ اور ہندوستان کو دنیا کا سب سے بڑا زبردست و دولت مند ملک بنا دیں۔

"وقت آگیا ہے کہ قریہ بہ قریہ شہر بہ شہر، اور صوبہ بہ صوبہ تجارت اور صنعت و حرفت کے بڑے بڑے کارخانے، بنک، کالج، مدرسے کتب خانے اور بیت الحکمت قائم ہو جائیں۔

"یہ وقت ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر آرہا ہے۔ یہ عظیم الشان انقلابات جن سے ہندوستان میں ایک نئی زندگی پیدا ہونے والی ہے، اٹل ہیں ان کا آنا ایسا ہی ہے جیسا اپنی ساعتِ مقررہ پر آفتابِ زرنگار کا دریچۂ خاور سے سر باہر نکالنا۔"

اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "ستارۂ صبح" کے پہلے شمارے کی تصویر کشی کی جائے۔ سرورق کے اوپر "ربِ زدنی علما" ماٹو کے طور پر درج ہے اس کے بعد یہ شعر دیا گیا ہے۔

من آں ستارۂ صبحم کہ در محلِ طلوع
ہمیشہ پیشِ روِ آفتاب می باشم

پھر اخبار کے نام کی تختی ہے۔ اُس کے نیچے ایک طرف "نشاۃ الثانیہ" کے عنوان سے مولانا ظفر علی خاں کی ایک نظم درج ہے۔ جو اس اخبار کی معاشی اور معاشرتی پالیسی کی غماز ہے۔ اس کے بالمقابل اکبر الہ آبادی کا تازہ ترین کلام دیا گیا ہے صفحہ ۲ پر "جواہر ریزے" کے عنوان سے مولانا سگ گزیدگی کے واقعہ، کسولی میں علاج، سر مائیکل اوڈوائر سے ملاقات اور روزنامہ "ستارۂ صبح" کے اجرا کی اجازت کا ذکر فرمایا ہے۔ پھر دو صفحوں پر مشتمل ایک افتتاحیہ درج کیا گیا ہے۔ جس سے ہم نے اقتباس پیش کئے ہیں۔

"طلوعِ صبحِ امید" کے عنوان سے ایک شذرے میں بتایا گیا ہے کہ ادارۂ تحریر میں مسٹر اختر علی خاں۔ علامہ عبداللہ العمادی، سید وحید الدین سلیم

پانی پتی، مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی، مولوی خواجہ عبدالحی، مرزا امان اللہ خاں وزیر آبادی، اور مرزا سعید بیگ شامل ہیں۔ اسی میں مولانا نے "دائرۂ معارف مشرقیہ" کی تحریک کا منصوبہ بیان کیا کہ "اس کے ذریعہ سے مشرق و مغرب کے ادبیات کا، نقادانِ فن کے لئے ست کھینچ کر رکھ دینا مقصود ہے"۔ اس کے لئے تیس ہزار روپے کے سرمائے کی ضرورت کا اعلان کیا۔ دو صفحات میں جنگی اور قومی خبریں درج ہیں۔ اس کے بعد "اسرارِ خودی" کے اشعار جلی قلم سے درج کر کے اُن کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔ حضرتِ علامہ اقبال کا ایک مقالہ بھی درج ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنِ شعر کے مبصّر کی حیثیت میں۔ شاعری کا موضوعِ صحیح" اس میں اقبال نے اپنا نظریہ فن برائے مقصد ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"ہر وہ استعداد، جو مبداء فیض نے فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے۔ اور ہر وہ توانائی، جو انسان کے دِل و دماغ کو بخشی گئی ایک مقصدِ وحید اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے یعنی قومی زندگی۔ جو زندگی آفتاب بن کر چمکے۔ قوت سے لبریز ہو۔ جوش سے سرشار ہو۔ ہر انسانی صفت اس غایتِ آخریں کی تابع اور مطیع ہونی چاہیئے۔ اور ہر شئے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں۔ اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ اُنہی پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے)، اُن کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں۔ انحطاط اور موت کا پیغام ہیں"۔

دوسرے مضامین کے عنوان یہ ہیں: شرافت کا معیارِ اصلی۔ عرب کا فیضانِ عمومی۔ ہندوستان کے علومِ قدیمہ۔ مسلم خواتینِ ہند کا مستقبل۔ دورِ غزنویہ از ڈاکٹر سیف الدین کچلو، جادوئے دکن۔

یہ حرف پہلے شمارے کی کیفیت ہے۔ اس کا جو پہلا فائل مجھے مولانا غلام رسول مہر کی وساطت سے حاصل ہوا۔ اُس کے مطالعہ سے میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ اخبار علم و ادب کا ایک نادر مخزن تھا۔ اور مولانا ظفر علی خاں کی صحافت میں اِسے اس لحاظ سے خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ آپ نے اس کے لئے جتنے مضامین اور اداریئے لکھے اتنے شاید "زمیندار" کے دورِ جدید میں پورے ربع صدی میں بھی نہ لکھے ہوں۔ مولانا ظفر علی خاں کی ساری عمر ہنگاموں میں کٹی۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء تک وہ عملی صحافت کے میدان میں رہے۔ اس میں بھی کچھ خلا آئے۔ مثلاً "زمیندار" کی بندش اور "ستارۂ صبح" کے اجراء کا درمیانی وقفہ۔ اس کے بعد "ستارۂ صبح" ۱۹۱۸ء میں بند ہوگیا۔ اور ۱۹۲۱ء میں "زمیندار" دوبارہ نکلا۔ گویا دو ڈھائی سال کا ایک اور وقفہ آگیا۔ ۱۹۲۱ء میں ابھی چند مہینے کام کیا کہ پانسال کے لئے قید ہوگئے اور پھر سیاست میں اس طرح اُلجھے کہ صحافت مُنہ دیکھتی رہ گئی۔ یہ درست ہے کہ وہ ایک عرصے تک "زمیندار" کے مدیرِ اعلیٰ تھے۔ اور کبھی کبھی اداریہ نگاری کر لیتے تھے۔ لیکن شاذ ہی کوئی مکمل اداریہ لکھا۔ تھوڑا سا لکھتے اور پھر کسی ماتحت سے کہتے کہ مکمل کر دو۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء تک کے دَور میں اُنھوں نے زیادہ تر سیاسی اداریئے لکھے۔ جن کا بلند آہنگ اور خطیبانہ انداز اور بے باکی اُس دَور کی طوفانی سیاست کی غماز ہے۔ لیکن ایسی اداریہ نگاری میں منفی اسلوب غالب رہتا ہے اور منفی قسم کی چیزیں

لکھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ فنی نقطۂ نگاہ سے اُن کی غیر سیاسی اداریہ نگاری زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ مثبت اسلوب کی حامل ہے اور اس میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہم اس مقالے کے آخر میں چند غیر سیاسی اداریوں کے اقتباس پیش کرتے ہیں۔

حکومت کے ساتھ تعاون

"احرارِ اسلام کا ایک نہایت نامور گروہ مہلب بن ابی صفرہؒ بھی تھا جو ایک مدت تک باطل پرستی کے مقابلے میں سربکف کوششیں کرتا رہا۔ مگر جب اس کو معلوم ہوا۔ کہ اسلام کی بہترین خدمت بہ حالتِ موجودہ اسی صورت میں ممکن ہے۔ کہ حکومت کے ساتھ مل کر رفاہِ عام کے کام کئے جائیں۔ تو اس نے اپنی ساری طاقتیں اسی ایک محور پر لگا دیں اور اسلام میں یہ روش ایسی مقبول ہوئی کہ جو اس کے مخالفین تھے۔ بعد میں وہ بھی اس کی خدماتِ جلیلہ کا اعتراف کرنے لگے۔ حتیٰ کہ اس کی وفات پر اس کے سب سے بڑے دشمن کو بھی کہنا پڑا تھا کہ اب وہ غزوات و فتوحات کہاں جن سے مسلمان دولت مند ہو جاتے تھے۔ اب تو مہلب نے وفات کیا پائی کہ فیض و کرم کو بھی موت آ گئی۔

"ہم کیا اور ہماری خدمت ہی کیا، لیکن اسلامی تاریخ نے ہم کو بھی وہی نصب العین سکھایا ہے۔ جس کی شرح مہلب بن ابی صفرہ کی تاریخِ حیات نے کی تھی کہ حکومت کے ساتھ مل کر ملک و قوم کی خدمت کی جائے اور جان و دل سے یہ فرض ادا ہو

نصب العین تو ہمارا ابھی وہی ہے۔ جو مہلب کا تھا۔ البتہ ہم میں اور مہلب میں انقلابِ زمانہ کا یہ بڑا تفاوت حائل ہے کہ اس وقت کی اسلامی پبلک نے مہلب کی رفتار کی بالعموم تحسین کی تھی اور ہم پر بے سبب بدظنی کی جاتی ہے۔"

(۸ر اگست ۱۹۱۷ء)

سرمایہ و محنت

"اخبار نویسی کے کوچہ میں جب ہم نے قدم رکھا تو اوّلین مقصد جو ہمارے پیشِ نظر تھا۔ اس غریب طبقے کی حالت کی اصلاح تھی۔ جو اگرچہ نادار ہے۔ لیکن حقیقت میں ملک کا اصلی سرمایہ ہے۔ دولت مندوں کے لوازمِ عشرت، امرار کے جاہ و جلال سلطنت کی سطوت و جبروت، سب دریا اسی ایک چھوٹے سے چشمہ سے بہ نکلے ہیں۔ دہقان کے خون کی گرمی قومی زندگی کا اصل مایۂ حرارت ہے۔ کسان کے پسینے کا ایک قطرہ سلطنت کی حقیقی امید ہے۔ یہ جو شہروں میں رہتے ہیں اور اُجلے اُجلے گاؤ تکیے لگا کر جھجماتی مسندوں پر بیٹھتے ہیں اور پنڈالوں میں رونق افروز ہو کر آئے دن رزولیوشن پاس کرتے ہیں اور آرام کرسیوں پر لیٹ کر بہ زعمِ خود قومی مسائل کو حل کیا کرتے ہیں۔ بلکہ کائنات کو تہ و بالا کر دیا کرتے ہیں۔ یہ کیا ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ان کی حقیقت پرِ پشہ سے زیادہ نہیں۔" (۸ر اگست ۱۹۱۷ء)

اوقاف کا انتظام

"آج تک ہماری کسی کانفرنس اور کسی لیگ اور کسی انجمن کو

اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اوقافِ ہند کے متعلق ضروری اعداد و شمار فراہم کر کے ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔ اور اگر عام رائے اتنی زبردست نہ ہو کہ اوقاف کے موجودہ نااہل اور بعض صورتوں میں خائن متولیوں سے باز پُرس کر سکے تو پھر حکومت ہی کی خدمت میں ایک پُرزور، مگر مؤدبانہ عرضداشت اس مضمون کی پیش کرے کہ ان گراں بہا اوقاف کے نظم و نسق کے لئے ایک قانون وضع فرمایا جائے۔

" ہم ہر قومی کام کے لئے آئے دن چندے مانگا کرتے ہیں. جب کوئی مدرسہ بنانا ہوتا ہے۔ جب کوئی کالج قائم کرنا ہوتا ہے۔ جب کسی بیت الحکمت، یا دار الصنعت یا کتب خانہ کے قیام کے لئے سرمایہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب بیواؤں کی خبر گیری اور یتیموں کی دست گیری کے واسطے دار الایامیٰ یا دار الیتامیٰ کی بنیاد ڈالنے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے تو ہم کاسۂ گدائی ہاتھ میں لے کر یا گلے میں جھولی ڈال کر کوچہ بہ کوچہ دِہ بہ دِہ قریہ بہ قریہ، اور شہر بہ شہر دریوزہ گری کرتے پھرتے ہیں اور پھر بھی ناکام رہتے ہیں۔ حالانکہ ہم قطروں کے فراہم کرنے والوں کے لئے ایک چشمۂ نوشش، ایک دریائے ذخار پہلے سے ہمارے آباو اجداد کے اسلامی ایثار نے کروڑوں روپے کے اوقاف کی شکل میں مہیا کر رکھا ہے کہ اگر ہم اسی سرمائے سے کام لیں اور اسی کا انتظام خوش اسلوبی سے کر سکیں تو پھر ہمیں کسی چندہ کی احتیاج باقی نہیں رہ سکتی۔" (۸ر اگست ۱۹۱۷ء)

دارالایامیٰ کی ضرورت

مولانا ظفر علی خاں نے چند مقالات میں قارئین کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ لاہور میں ایک انجمن قائم کی جائے جو تمام ایسی مسلمان بیواؤں کے بارے میں اعداد و شمار جمع کرے۔ جو محتاج و مفلس ہیں۔ ان میں جو بیوائیں بڑھاپے یا بیماری کے سبب سے کام نہ کر سکیں۔ اُنھیں وظائف مہیا کئے جائیں، اور باقی بیواؤں کے لئے ایک مرکز دارالایامیٰ کے نام سے بنا دیا جائے جہاں اُنھیں کام مہیا کیا جائے تاکہ وہ خود اپنی روزی کمانے کے قابل بن جائیں۔ اس مسئلے پر ایک اداریئے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"غریب مسلمان بیوائیں، جن کی بسر اوقات کا سہارا اگر ہے تو خدائے قدوس کی ذاتِ بے ہمتا۔ عموماً اپنے سیہ خانوں میں، جن کی ظلمت کو شمعِ امید کی کرن شاید ہی چیرتی ہو تو چیرتی ہو مصیبت و کلفت کے عالم میں بیٹھی ہوئی اختر شماری کیا کرتی ہیں۔ خاوند، جو زندگی کا رفیق تھا اور اسی کے دم سے زندگی کی ساری خوشیاں اور کامرانیاں تھیں۔ ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے چکا ہے۔ اب دُکھ درد سُنے تو کون سُنے۔ ٹوٹے ہوئے دل کی پاک آرزوئیں بر آئیں تو کیونکر۔ دن کو بے مہر سورج آنکھیں دکھاتا ہے۔ شام آتی ہے تو پہاڑ سی کالی رات منہ پھلائے ہوئے ایک نیا پیغامِ غم لاتی ہے۔

"خدا کی رحمت کا سایہ اُن ناتوانوں کے سروں پر ہو تو ہو۔ لیکن ہماری بے نیاز قوم کو ان کا خیال تک نہیں۔ اگر غیرت ہم سے

بالکل ہی چھین نہیں لی گئی ہے۔ اگر دردِ اسلامی، جس کا ادعا بڑے بڑے مفتیانِ شرعِ متین اور حامیانِ دینِ مبین کو ہے، دلوں کی بجائے کلام اللہ کی آیات ہی میں مدفون ہیں، تو وقت آگیا ہے کہ ہم اٹھیں۔ اور بیواؤں کے کس مپرس طبقے کی طرف دستِ اعانت بڑھائیں کہ اسی طرح ہم تلافیٔ مافات کر سکتے ہیں۔ اور خدائے پاک اور اس کے رسولِ امینؐ کے دربار میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ (۶ ستمبر ۱۹۱۷ء)

بدمذاق صحافت

"کنکوے اُڑانے والے، افیون کی چُسکی گھول کر پینے والے، مدک کے چھینٹے اُڑانے والے، شاہدانِ شوخ و شنگ سے آنکھیں لڑانے والے، داغ کی غزلوں پر سر دُھننے والے، داستانِ امیر حمزہ اور بیتال پچیسی کی ورق گردانی کرنے والے کیا جانیں کہ "ڈارون" کس بوزنہ کا نام ہے "رسکن" کون مسخرہ تھا۔ اور "رینان" کون جانگلو ہے۔ شاید کہا جائے کہ غوامضِ علمیہ سے طبیعتوں کا ناکارہ ہونا اور حقائقِ معقدہ کی گرہ کشائی سے الجھنا اگر قوم کا عام شیوہ ہو رہا ہے۔ تو اس کا باعث کچھ تو طریقِ تعلیم کا ناقص ہونا ہے اور کچھ صحافتِ حاضرہ کی بدمذاقی ہے جو جمہور کو اس راستے پر لگاتی ہی نہیں۔ یہ الزام ایک بڑی حد تک صحیح ہے۔ ہماری تعلیم بھی ادھوری ہے اور ہم اخبار نویس بھی سخت مجہول و نامعقول واقع ہوئے ہیں کہ لوگوں کے مذاق میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس موضوع پر ہم شرح و بسط کے ساتھ

قلم اٹھانے کا کسی فرصت کے وقت ارادہ رکھتے ہیں لیکن سرِ دست صرف اس قدر عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ کہ جس حد تک "ستارۂ صبح" کی ناچیز مساعی کا تعلق ہے۔ ہم اپنی اور اپنے ہم قلموں کی نالائقی کی تلافی ایسے مضامین کی اشاعت سے کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ جو عام پسند ہونے کے ساتھ ساتھ خاص پسند بھی ہوں۔ یہ ایک بڑا کٹھن کام ہے اور بڑا سخت مرحلہ ہے۔ جس میں چپے چپے پر ایک نئی ہوش رُبا منزل ہے۔ قدم قدم پر ایک نئی زہرہ گداز ہفت خواں ہے۔ ایک اکیلے شخص کی قوتِ بازو، خواہ وہ رستمِ زماں اور اسفندیارِ دوراں ہی کیوں نہ ہو۔ اس وادیٔ کرب وبلا کو طے نہیں کر سکتی۔ خدا کی توفیق چراغِ سرِ راہ ہونی لازم ہے۔ ہمدرد احباب کی اعانت رفیقِ طریق ہونی چاہیئے (۷، ستمبر ۱۹۱۷ء)

مولانا ابوالکلام آزاد اور "البلاغ"

۱۹۱۴ء کا ذکر ہے "الہلال" کی دو ہزار روپے کی ضمانت ضبط ہوگئی اور دس ہزار کی مزید ضمانت طلب ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ضمانت داخل کرنے سے بہتر یہی جانا۔ کہ "الہلال" کو بند کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کے بعد "الہلال" کا کوئی شمارہ نہ نکلا اور وہ مصور ہفت روزہ بند ہوگیا۔ جس نے برعظیم کی اردو صحافت کو نئی راہوں سے آشنا کیا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ جاری تھی اور برعظیم میں اجنبی حکومت نے تحریر و تقریر پر سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ ان حالات میں آزاد جیسی پارہ صفت شخصیت جب اظہارِ خیال کی متمنی ہوتی۔ تو اپنا راستہ مسدود پاتی۔ آخر آزاد نے سیاست سے کنارہ کش ہو کر صرف قرآنِ حکیم کی تبلیغ و دعوت کو مطمحِ نظر بنایا۔ اس میں وہ بالواسطہ نیم سیاسی اظہارِ خیال بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو "البلاغ" کے نام سے ایک نیا اخبار جاری کیا۔ کہنے کو تو یہ ہفت روزہ تھا۔ لیکن کبھی پندرہ روز بعد کبھی تین ہفتے بعد نکلا کرتا تھا۔ پہلے شمارے میں متن کے پہلے صفحے پر کلامِ اقبال

درج کیا گیا۔ ملاحظہ ہو:۔

محل ایسا کیا تعمیر عُرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اُس نے نوا ایسی
میسر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشکِ عنابی

٭ ٭ ٭

مرے دل نے یہ اک دن اُس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بے تابی
تغیر آگیا ایسا مزاجِ اہلِ عالم میں
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی
فغانِ نیم شب شاعر کی، بارِ گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطفِ بے خوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت رُبا کیوں کر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

٭ ٭ ٭

صدا تُربت سے آئی، شکوۂ اہلِ جہاں کم کُن
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

ذوقِ نغمہ کم تھا، لیکن نوا کو تلخ تر کرنا بھی کچھ آسان نہ تھا۔ بہر حال یہ کیا کم تھا۔ کہ نوا بلند تو ہوئی۔ اور حسرت موہانی نے ایک غزل میں اس طرف اشارہ کیا۔

غم سے نہیں ایک دل بھی آزاد
فریاد ز دستِ عشق فریاد!

عاشق ہوئے اور مر مٹے ہم
اپنی تو یہ مختصر ہے روداد!

ہوگا کسے جان دینے میں عذر؟
ارشاد اور آپ کا پھر ارشاد!

جاں باز ہے عشق، حُسن دلبر
یہ دونوں امور ہیں خداداد

اُس چشم نے دلبری کے شیوے
سب سیکھ لئے بغیر اُستاد

رہنے لگی اُن کی یاد ہر دم
اب ہم کو رہے گا اور کیا یاد!

پردے میں ستم کے لطفِ حسرت
ہے اُس بتِ حیلہ جو کا ایجاد

دِل کشتۂ غم ہے جان برباد
مایوسِ فراق ہوں میں ناشاد

عاشق کا ہے کام جان دینا
اپنا جی ہے اس خیال پر صاد

با نرمیٔ حُسن و گرمیٔ خو
اُس ذات میں ہیں صفاتِ اضداد

بھُولے ہیں اورسب فسانے
اک قصۂ آرزو رہا یاد
ہو حُسن کہ عشق، سب ہیں فانی
شیریں ہی رہی، رہا نہ فرہاد
اربابِ وفا پرست وحق کوش
تھا جن سے دیارِ صدق آباد
سب ہو گئے چُپ، بس ایک حسرت
گویا ہیں، " ابوالکلام آزاد"

(۲۶ر نومبر ۱۹۱۵ء)

جہاں تک "البلاغ" کے مقاصد کا تعلق تھا۔ پہلے دو شماروں کے ابتدائی صفحات عربی کے خطبۂ افتتاحیہ نے لے لئے۔ تیسرے شمارے میں "عہدِ التوا و انتظار" کے عنوان سے اس اخبار کی شانِ نزول بیان کی پہلے "الہلال" سے دس ہزار روپے کی ضمانت کی طلبی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "اس دور میں یہ رسم بن چکی ہے کہ جب کسی اخبار سے ضمانت طلب ہوتی ہے۔ فوراً چندے کی فہرست کھول دی جاتی ہے" یکے بعد دیگرے پریسوں سے ضمانتیں مانگی گئیں۔ اور انھوں نے عام پبلک سے اپیل کی۔ پبلک نے پورے جوش وخروش سے اس پر لبیک کہا اور ایک ایسی مستعدی و سرگرمی کے ساتھ جس کی نظیر ہندوستان کے تمام جماعتی کاموں میں نہیں مل سکتی، دو ہزار سے لے کر پندرہ ہزار تک کی رقمیں چند ہفتوں میں فراہم کر دیں۔ ایک شخص کے حساب کے مطابق تقریباً چالیس ہزار روپیہ اب تک ضمانتوں کے لئے مسلمان دے چکے ہیں۔۔۔

بایں ہمہ اس عاجز نے ابتدا سے اپنے کاموں کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس حالت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے تھے"

مولانا آزاد نے بتایا کہ دو قسم کی صحافت ہو سکتی ہے۔ ایک ہندستان کی دکاندارانہ صحافت۔ جس میں ہر شریف آدمی کے نام اخبار کا وی پی بھیج دیا جاتا ہے اور جو وصول نہیں کرتا۔ اُسے گالیاں دی جاتی ہیں۔ دوسری یورپی صحافت ہے۔ جس میں محرک جذبہ تجارت کا ہوتا ہے۔ پیسہ بے دھڑک لگایا جاتا ہے۔ گاہک کی مرضی کی چیزیں چھاپی جاتی ہیں اور اس طرح صحافت منافع بخش ہو جاتی ہے۔ لیکن اُن کے نزدیک ان دونوں راہوں میں کوئی بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ وہ تاجر نہیں۔ داعی ہیں "تاجر کی تمام قوتوں کا مقصد نفعِ خاص تھا۔ وہ جس قدر زیادہ اس سبق کو یاد کرے گا۔ اتنا ہی زیادہ اچھا تاجر ہو گا۔ مگر داعی کی تمام قوتوں کا مصرف نفعِ عام ہے یعنی دوسروں کو فائدہ پہنچانا، اور جس قدر سچائی، جس قدر خلوص، جس درجہ اذعان و یقین کے ساتھ اس درس ایثار کو حاصل کرے گا۔ اتنا ہی سچا داعی ہو گا۔

اس کے بعد تقریباً ایک مہینہ پرچہ بند رہا۔ ۱۴، ۲۱ اور ۲۸ جنوری ۱۹۱۶ء کا مشترکہ شمارہ چھپا۔ تو اس میں پھر "عہدِ انتہار و انتظار" کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا۔ جس میں ایک بار پھر تجارت اور دعوت کے فرق کو واضح کیا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"بلاشبہ میں نے پریس کھولا اور یقیناً میں نے ایک رسالہ جاری کیا۔ لیکن یہ صرف اس لئے کیا کہ اظہارِ خیال اور تبلیغِ مقصد کا اس سے بہتر اور زود عمل طریق اور کوئی نہ تھا۔ اور

میرے پاس اتنی دولت نہ تھی۔ کہ میں لغت چھاپ کر تقسیم کیا کرتا۔ پس میرے تمام کاموں کی بنیاد تبلیغ ہے نہ کہ تجارت، میری اخبار نویسی کو تم اخبار نویسی نہ قرار دو کیونکہ میں نے اسے ضمناً اختیار کیا ہے۔ اور وہ میرا اصلی کام نہیں ہے میں نے اگر اُسے اختیار کیا تو یہ ہندوستان کی اخبار نویسی اور مطبوعہ اشاعات کے لئے بہتر ہوا۔ اور اس کے لئے ترقی کی ایک بالکل نئی راہ کھلی مگر خود میرے لئے اس میں کوئی شرف نہیں کیونکہ میرے کاموں کے لئے اصل راہیں دوسری تھیں ؎

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما"

آپ نے "الہلال" میں اپنے مالی زیاں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے داعی کی حیثیت سے جو کام کیا۔ اُس نے جو مجھے ذہنی اطمینان عطا کیا۔ وہ ہزار لعل و جواہر سے بہتر ہے اس لئے "اس سرزمین میں سب سے بڑا دولت مند آدمی میرے سوا اور کوئی نہیں"۔ آخری پیرا ملاحظہ ہو:

"پھر تم اس کی نسبت کیا کہتے ہو۔ جس نے خاک دی اور اس کے معاوضے میں سونا پایا؟ میں نے تین چار سال تک اپنی تبلیغ و دعوت کی تجارت کی اور زخارفِ دنیوی کی ایک حقیر پونجی اس میں لگا کر کھو دی۔ لیکن دیکھو کہ خدا نے اس کے معاوضہ میں ہزاروں انسانوں کے دل، لاکھوں مسلمانوں کی روحیں، متعدد بڑی بڑی آبادیاں اور بستیاں، اُن کے عقائد و اعمال کی

تبدیلیاں، صدہا مومنینِ کاملین اور عباد اللہ مخلصین کی ایمان پرستیاں، اور ان سے بھی بڑھکر یہ کہ کلمۂ حق و قرآن کا ایک انقلابی دورِ عظیم میرے خزانۂ اقبال میں کس طرح جمع کر دیا ہے؟"

۱۹۱۴ء میں مولانا آزاد نے "دارالارشاد" کی بنیاد رکھی تھی اس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا:۔

"چند سال پیشتر کا واقعہ ہے۔ کہ مشیتِ الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی اور الہلال نے قرآنِ حکیم کی تبلیغ و دعوت کی صدا از سرِ نو بلند کی۔ لیکن اس عرصہ میں جو کچھ ہوا۔ وہ ایک دعوتِ عام تھی، جس کے ذریعہ فہم و بصیرتِ قرآن کی نئی راہیں عوام و خواص نے اپنے سامنے دیکھیں۔ اور قرآنِ حکیم کے عشق و شیفتگی کا ایک نیا ولولہ دلوں میں پیدا ہو گیا۔ تاہم اس دعوت کی ایک دوسری منزل ابھی باقی ہے۔ اور وہی فی الحقیقت اہم تر مقامِ سعی و تعب ہے۔ یعنی قوم میں بکثرت ایسے افراد پیدا کئے جائیں جو انہی راہوں پر چل کر قرآنِ حکیم کے علوم و معارف کو بہ تکمیل حاصل کریں۔ اور اُن کے ذریعہ قوم میں ارشاد و ہدایت اور احیائے دعوت و ذکر کا عملی سلسلہ بالعموم شروع ہو سکے۔

"ہمارے کاموں کی بڑی قسمیں صرف دو ہی ہیں۔ مسلمانوں کی داخلی اصلاح و احیائے علم و عمل، اور غیر قوموں میں اسلام کی تبلیغ۔ یہ دونوں کام بغیر کسی ایسی جماعت کی موجودگی کے انجام نہیں پا سکتے۔ جس قدر تحریکیں، انجمنیں، کانفرنسیں اور متفرق کوششیں بغیر اس کے ہوں گی۔ وہ اُسی طرح ضائع جائیں گی۔ جس طرح اب تک

ضائع جا چکی ہیں۔

"دارالارشاد کا مقصد یہی ہے۔ کہ دعوۃ الی القرآن کی اس دوسری منزل کا سر و سامان ہو۔ اور تھوڑے وقت اور بہت زیادہ صرفِ علم و فکر سے ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو قرآن حکیم کی دعوت و تبلیغ کی خدمت اور اصلاح و ارشادِ اُمّت کا فرض انجام دے سکے۔ (۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء)

"البلاغ" کے لکھنے والوں میں یہ شخصیتیں شامل تھیں: علامہ اقبالؔ، حسرتؔ موہانی۔ سید سلیمان ندوی۔ عبدالسلام ندوی۔ وصی احمد بلگرامی۔ ابوالنصر محمد عبدالغفار محمد اسماعیل پانی پتی۔ خواجہ عبدالحئی۔ شمس اللہ قادری۔ محمد اختر مصباح الدین۔

مختلف مستقل عنوانات کے ماتحت جو مقالے چھپے ان کی ایک فہرست ملاحظہ ہو:

اسوۂ حسنہ: کائناتِ خلقت۔ اعمالِ نبوت بہ حیثیت محتسب۔ حضرت سلمان فارسی۔ تفویض و اطاعت۔

مقالات: جنگ کا اثر فنِ روایت پر۔ امن اور اسلام۔ الدین والسیاسہ اسلام اور تربیتِ عسکریہ۔ اسلام اور سوشلزم۔ اصلاحِ معاشرت اور اسلام۔

بصائر و حکم: جنگ کا اثر اخلاق پر۔ السّلم والحرب یعنی جنگ اور صلح، جنگ اور مطالعۂ علم النفس۔

مذاکرۂ علمیہ: النوم عند الانسان۔ التحول النخاعی۔

شئونِ اسلامیہ: عراق و لیلائے عراق۔

بریدِ فرنگ: ایک فرانسیسی جاسوس جرمنی میں۔ دائرۂ قطبِ شمالی۔

تاریخ و عبر: حادثۂ محزنہ کربلا۔ الحرب فی الاسلام۔ تاریخ معتزلہ کا ایک ورق۔

آثارِ عتیقہ: آثارِ اسلامیہ، امارتِ بیجاپور

باب التفسیر: فلسفۂ احتساب۔ الاصلاح والافساد۔ حقیقتِ بقائے اسلام وفنائے کفر۔ انسان کی حیاتِ صالحہ۔ تاریخِ تمدنِ اسلام کا ایک صفحہ۔ غزواتِ اسلامیہ اور تجارت۔

اسئلہ و اجوبتھا: حکومتِ سوریٰ اور اسلام۔ تفسیر سورۂ والتّین۔

احرارِ اسلام: خطابۂ الم د توحیدِ شہادت۔

تذکارِ مقدس: ماہِ ربیع الاوّل۔

مطبوعاتِ جدیدہ: معراج العقول۔

مختارات: شبلی کی "الفاروق" سے حضرت عمر کا مقام۔ تاریخِ مدنیتِ اسلام کا ایک سرسری درس۔

متفرق: جامع ازہر۔

مولانا آزاد "الہلال" میں کبھی کبھی "افکار و حوادث" کے عنوان سے ایک ہلکا پھلکا نیم مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ "البلاغ" میں بھی دو ایک بار یہ کالم لکھا۔ ایک کالم میں درج کرتا ہوں تاکہ اُن کے مزاح کے انداز کو قارئین سمجھ سکیں:

افکار و حوادث

گذشتہ جنوری میں مجوزہ شیعہ کالج کا جو وفد ہز آنر ہز مسٹن بہادر کی خدمت میں بہ مقام لکھنؤ پیش ہوا تھا۔ اس کی روئداد اب ایک رسالہ کی شکل میں شائع کی گئی ہے۔ روئداد کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۴ر جنوری کو گورنمنٹ ہاؤس لکھنؤ میں ایڈریس پیش کیا گیا

اور اس کے جواب میں خطابِ ملوکانۂ ہمایونی نے عرض و نیاز کے ایک ایک لفظ کو خلعتِ قبولیت و پذیرائی عطا فرمایا:

دیدارِ ہم میسّر و بوس و کنار ہم
از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

اِدھر عرض نیاز کی ارادت کیشی تھی، تو اُدھر نگاہِ مہر و کرم کی عجز پروری۔ اِدھر عشق کام طلب کی امید واری تھی تو اُدھر حُسنِ عشق نواز کی کام فرمائی۔ اِدھر "ادعونی" کی تعمیل میں دستِ دعا دراز تھا، تو اُدھر وعدۂ "استجب لکم" کی تصدیق میں دروازۂ استجابت باز۔ ایک طرف سراسر عشق تھا۔ دوسری طرف سراسر حُسن۔

وجودِ او ہمہ حسن ست و ہستیم ہمہ عشق
بہ بخت دشمن و اقبالِ دوست سوگند ست!

رسم و راہِ کوچۂ عشق کے واقف کار جانتے ہیں کہ یہاں حق و ہنر کا سوال کام نہیں دیتا، بلکہ اس دنیا کا سارا دار و مدار محض بخشش و کرم پر ہے۔ اس کی نظریں جس پر پڑ جائیں اور اس کی بے نیازی جس کو سرفراز کر دے، وہی سب سے زیادہ مستحق، اور اُسی میں سب سے بڑا ہنر ہے۔ استحقاق و ہنر دکھلا کر چاندی اور سونا لیا جا سکتا ہے لیکن محبت کی نظریں اور پیار کی ادائیں نہیں خریدی جا سکتیں۔ ارسطو اگر لیلیٰ کے خیمہ کا پردہ اٹھاتا۔ اور قیس کی دیوانگی کے مقابلہ میں اپنے فنِ منطق کو پیش کرتا۔ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا جواب ملتا:

معمورۂ دے اگر ت ہست باز گوئے
کاینجا سخن بہ ملکِ فریدوں نمی رود

پس عالمِ حسن وعشق کے کاروبار اور رد و قبول کے احکام دوسرے ہیں۔ اور یہاں سب سے بڑا جوہر، سب سے بڑا ہنر، سب سے بڑا استحقاق، سب سے بڑی دلیل اور سب سے بڑا صغریٰ کبریٰ یہ ہے کہ اُس کی نظریں قبول کر لیں، اور وہ کہ سب چاہنے والوں کی چاہتیں اُسی کے لئے ہیں۔ خود کسی کی شیفتگی کو اپنی چاہتوں کے لئے پھانس لے پھر جس کو خود وہ چاہے اس کی قسمت کا کیا پوچھنا۔ کہ عشق کی شہنشاہی اور اقلیمِ حُسن کی فرماں روائی ہے۔ بن پڑے تو اپنی چاہتوں میں اس خوش نصیب کو بھی شامل کر دیجئے۔ کہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے۔ اور مذہبِ عشق کا منتہائے کمال یہی ہے۔

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے
وہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے؟

مرحوم ذوق کی غزلوں میں مَیں اپنا ذوق بہت کم پاتا ہوں۔ تاہم ایک شعر اُن کا بھی یاد آگیا:

تم جسے یاد کرو پھر اُسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہے پروا نہ خدا یاد رہے

اردو شاعری میں جس چیز کو "معاملہ گوئی" کہتے ہیں۔ شعرائے ایران

اسے "وقوعہ گوئی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اواخرِ عہدِ صفویہ میں فغانی کے اسکول نے جو شعراء پیدا کئے، انھوں نے خاص طور پر اس رنگ کو بہت ترقی دی۔ ازاں جملہ ضمیری صفاہانی ہے جس کا ایک شعر مجھے نہیں بھولتا۔

چو می بینم کسے از کوئے او دل شاد می آید
فریبے کز دے اول خوردہ بودم یاد می آید

اس وفد نے جو ایڈریس پیش کیا تھا۔ وہ اس قدر دلچسپ نہیں ہے جس قدر ایڈریس کا جواب دلچسپ ہے، اور ایسا ہونا ضروری تھا۔ عشق خواہ کسی شکل میں ہو، عجز و نیاز کے لئے ہے۔ دلبری و رعنائی کے لئے نہیں ہے۔ یہ خواص حُسن کے ہیں۔ اس کا کوئی جلوہ دلربائی و نظارہ پروری سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ تو وہ چیز ہے کہ اگر بے مہری و غیظ و غضب میں ہو، جب بھی پیار کرنے ہی کی چیز ہوتی ہے، پھر لطف و نوازش اور بخشش و کرم کی ہوش ربائی کا کیا پوچھنا:

ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

ہز آنر اپنے جواب میں فرماتے ہیں "اس بیان سے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھ کو کسی قوم یا مذہب کے لوگوں کی کوئی خاص رعایت منظور ہے۔ نہ میرا یہ منشا ہے کہ جو بڑی بلیغ کوششیں اب تک مسلمانوں کی ترقی تعلیم کی نسبت کی گئی ہیں۔ اُن کی

بے قدری کی جائے۔" لیکن ہم حیران ہیں کہ اس جملے کے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ بھلا ایک منٹ کے لئے بھی کوئی عقل مند ہز آنر کی نسبت ایسی بدگمانی کر سکتا ہے؟

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

ہم نے ابھی کہا ہے کہ شیوۂ عشق و کمالِ شیفتگی یہ ہے کہ معشوق پر حکمرانی نہ کیجئے، بلکہ اپنے عشق کو اس کے فرمانِ حُسن کا محکوم کر دیجئے۔ فلسفۂ حُسن و عشق کے سب سے بڑے حکیم عرفی شیرازی کا قولِ فیصل آپ کو معلوم ہے۔

قبولِ خاطرِ معشوق شرطِ دیدا ست
بحکمِ شوقِ تماشا مکن کہ بے ادبی ست

آپ کو اگر دعوائے محبت ہے تو ہر اُس شے کو پیار کیجئے جس پر پیار کی ایک غلط انداز نظر بھی اُس نے ڈال دی ہو۔ مذہب عشق کی منزل "تفویض" یہی ہے۔

چنانچہ الحمد للہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مدعیانِ عشق و کمالِ عشق نے یہی شیوہ اختیار کیا ہے۔ ازاں جملہ مجمعِ عشاقِ علی گڑھ کثرہم اللہ تعالیٰ ہے۔ باوجودیکہ یہاں کا ہر مجنون و فرہاد مسئلہ تعلیم کے بارے میں ایک لمحہ کے لئے بھی متحملِ رقابت نہ تھا۔ لیکن جونہی نظرِ محبوب نے اپنی محبوبیت کا اعلان کر دیا۔ معاً سب نے ادعارِ رقابت کی تلوار نیام میں رکھ لی اور اب فیصلۂ سرکارِ حُسن کے آگے سب کی گردنیں

خم ہیں :

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

(۱۸ فروری ۱۹۱۶ء)

"البلاغ" میں مولانا کا ایک مضمون "افسانۂ ہجر و وصال" اُن کے خطیبانہ اسلوبِ نگارش کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ جس میں قوم کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ توبہ کر کے ایک بار پھر جادۂ عمل پر گامزن ہو۔ "افسانۂ زلف یا مسلم یونیورسٹی" اور "مجوزہ شیعہ کالج" ہی دو ایسے اداریئے یا مضامین ہیں جن میں واقعاتِ حاضرہ پر بحث کی گئی ہے۔ ورنہ عام طور پر "البلاغ" میں اہم خبریں اور مضامین چھپتے تھے۔ وہاں "البلاغ" اس موضوع پر خاموش رہا۔

۲۸ مارچ ۱۹۱۶ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کو قانونِ تحفظِ ہند کے ماتحت حکم دیا گیا۔ کہ وہ چار دن کے اندر اندر کلکتہ سے نکل جائیں۔ انھوں نے ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء کو "البلاغ" کا آخری شمارہ نکالا۔ اور اس طرح ساڑھے چار مہینے کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ اس دوران سات آٹھ سے زیادہ شمارے شائع نہ ہوئے۔

اردو رسائل کی کہانی

ایک سو پچیس برس پہلے کا ذکر ہے کہ برعظیم میں "خیر خواہِ ہند" کے نام سے اُردو کا پہلا رسالہ نکلا ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے دہلی اور لاہور ہماری علمی اور ادبی صحافت کے مرکز بن چکے تھے۔ دہلی میں دہلی کالج کے زیرِ اہتمام "قران السعدین"، "فوائد الناظرین" اور "محبِ ہند" جاری ہوئے۔ لاہور سے مطبعِ کوہ نور کے زیرِ سایہ "خورشیدِ پنجاب" نکالا گیا۔ ان کے علاوہ صرف شعر و شاعری کو فروغ دینے کے لئے گلدستوں کا آغاز ہوا۔ پہلا گلدستہ "گلِ رعنا" تھا۔ جسے مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۵ء میں دہلی سے جاری کیا۔ دوسرا گلدستہ "معیار الشعراء" تھا۔ جسے شیو نارائن آرام نے آگرہ سے نکالا۔ ان کے علاوہ قانونی، دینی، تعلیمی، اور طبی رسائل شروع ہوئے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ سب رسائل ختم ہو گئے۔ ان میں خالص ادبی رسالے تو گلدستے ہی تھے۔ باقی رسالوں میں علمی اور ادبی، دونوں قسم کا مواد ہوتا تھا۔ انقلاب کے بعد سرسید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ جو ادب، تعلیم و تدریس اور اصلاحِ معاشرہ کا علمبردار تھا۔ اُنیسویں صدی

ہی میں مولانا عبدالحلیم شرر نے ماہنامہ "دلگداز" جاری کیا جس میں ایک طرف تاریخی مضامین چھپتے تھے تو دوسری طرف ادبی مقالے شائع ہوتے تھے۔ نیز ایک ناول بالاقساط دیا جاتا تھا۔

اُنیسویں صدی پلٹنے کو تھی کہ شیخ عبدالقادر کی ادارت میں لاہور سے "مخزن" جاری ہوا۔ یہ محض ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اردو ادب کو نئی اصناف سے آشنا کرایا جائے۔ نثر اور شاعری میں نت نئے تجربے کئے جائیں اور مغربی ادب کے شہپارے اردو میں منتقل کئے جائیں۔ اس تحریک کی بدولت انگریزی تعلیم یافتہ طبقے نے اُردو ادب میں دلچسپی لی۔ اور یہی تحریک اردو ادب میں نشاۃِ ثانیہ کا باعث ہوئی۔ بہرحال "مخزن" میں صرف ادبی ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے علمی اور معلوماتی مضامین چھپتے تھے۔ "مخزن" کا ایک اہم ہم عصر "اردوئے معلّٰی" تھا جس کے مدیر مولانا حسرت موہانی تھے۔ اس رسالے کا مزاج سیاسی بھی تھا اور ادبی بھی۔ ہر شمارے میں ایک دو سیاسی مضامین چھپتے تھے۔ جن کا لہجہ خاصا تُرش ہوتا تھا۔ دو ایک مقالے اردو ادب کی تاریخ پر ہوتے تھے۔ اور آخر میں غزلیات دی جاتی تھیں۔ اس کے بعد چار اہم علمی رسائل معرضِ وجود میں آئے۔

اول :۔ "الناظر" جسے مولانا ظفرالملک علوی نے لکھنؤ سے جاری کیا۔ یہ کلاسیکی ادب کا علمبردار تھا۔ لیکن سیاسی اور معلوماتی مضامین بھی پیش کرتا تھا۔

دوم :۔ "زمانہ" جسے منشی دیا نرائن نگم نے نکالا۔ یہ بھی خالص ادبی رسالہ نہیں تھا۔ اس میں جہاں ادبی مضامین دیئے جاتے تھے۔ وہاں سیاسی

اور دوسرے معلوماتی مقالے بھی درج کئے جاتے تھے۔

سوم :۔ "معارف" جو مولانا سید سلیمان ندوی کی ادارت میں اعظم گڑھ سے جاری ہوا۔ اس میں ادب کا عنصر کم تھا۔ اور فلسفہ، تاریخ، اور عمرانیات پر مضامین غالب تھے۔

چہارم : "جامعہ" جو جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، کے زیر اہتمام نکلتا تھا، اس میں بھی ادبی عنصر کم تھا اور علم السیاست، فلسفہ، بین الاقوامی سیاست اور تاریخ کا عنصر نمایاں تھا۔

موخرالذکر تین رسائل کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ان میں عصرِ حاضر کی علمی اور تہذیبی خبریں بالالتزام چھپتی تھیں۔ اور اردو مطبوعات پر تبصرے کئے جاتے تھے۔

نسوانی صحافت کا آغاز مولوی سید احمد کے "اخبار النساء" سے ہوا۔ لیکن اصل کام دو رسالوں نے کیا۔ اول۔ "تہذیب النسواں" جس کے بانی مولوی ممتاز علی تھے۔ دوم: "عصمت" جس کی بنیاد مولانا راشد الخیری نے رکھی۔ ان دو رسالوں نے نسوانی دنیا میں صالح اقدار کو رواج دینے میں جو عظیم الشان خدمات سرانجام دیں۔ انھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

اگلے دور میں اُونچے پایہ کے اہلِ دانش کے لئے انجمن ترقی اردو کا رسالہ "اردو" جاری ہوا۔ لیکن اس میں صرف تاریخِ ادب اردو پر مقالے شائع ہوتے تھے۔ (اور ہوتے ہیں)، اگرچہ اردو ادب کی رفتار سے آگاہ رہنے کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ لیکن دوسرے علوم پر مضامین کے لئے اس مجلے نے کچھ نہیں کیا۔ انجمن ترقیٔ اردو نے رسالہ "سائنس" جاری کیا۔ لیکن اس کی زندگی مختصر رہی۔ الٰہ آباد سے ہندوستانی اکیڈمی نے "ہندوستانی" کے

نام سے ایک علمی مجلّہ جاری کیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد جو رسائل جاری ہوئے وہ صحافتی زبان میں "ہردلعزیز" تھے۔ ان میں ادب کا عنصر غالب تھا۔ اور علمی عنصر کم تھا۔ بہرحال موجود ضرور تھا۔ ان میں ایک تو "ہمایوں" تھا۔ جسے میاں بشیر احمد نے اپنے والد ماجد جسٹس شاہ دین مرحوم کی یاد میں جاری کیا تھا۔ اس میں علاوہ ادبی مواد کے، حالاتِ حاضرہ پر چند مختصر، لیکن ٹھوس شذرات شائع کئے جاتے تھے نیز مہینے بھر کی خبروں کا خلاصہ بھی دیا جاتا تھا۔

سیّد امتیاز علی تاؔج کا "کہکشاں" ادبی صحافت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ لیکن اس کی زندگی مختصر رہی۔ حکیم یوسف حسن کا رسالہ "نیرنگِ خیال" اپنے دور کے بہترین ادبی۔ علمی۔ تاریخی اور تہذیبی مقالات کا حامل تھا۔ اور اس کے شاندار سالنامے۔ اس عہد کی ادبی روایات کے علمبردار تھے۔ تقریباً یہی کچھ حافظ محمد عالم کے "عالمگیر" کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ "ادبی دنیا" کے بانی مولانا تاجور نجیب آبادی تھے۔ اُن کے بعد منصور احمد مدیر بنے اور پھر مولانا صلاح الدین احمد کی ادارت میں اس کا وہ تابناک دور شروع ہوا۔ جو ربع صدی سے جاری ہے۔ اس رسالے کی بڑی تقطیع و اعلیٰ کاغذ اور اعلیٰ کتابت و طباعت، نیز بلند ادبی معیار نے اسے ہم عصروں میں ممتاز ترین جگہ عطا کی۔ مولانا نیاز فتحپوری کے "نگار" اور شاہد احمد دہلوی کے "ساقی" نے خدمت ادب میں نمایاں حصّہ لیا۔ پچیس تیس برس پہلے کا ذکر ہے کہ "کارواں" کے نام سے ایک سالانہ مجلّہ نکلا۔ اس کا ایک شمارہ مجید ملک نے اور ایک ڈاکٹر تاثیر نے مرتب کیا۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ادب کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ پر مقالات بھی پیش کئے جاتے تھے۔ جب ترقی پسند

ادب کی تحریک نے زور پکڑا۔ تو "ادبِ لطیف" اور "سویرا" نے جنم لیا۔ اور وہ نئے ادب کی عکاسی اور ترجمانی کا فرض انجام دیتے رہے۔

تقسیم کے بعد احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں "نقوش" نکلا۔ جو ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا۔ اس میں ادبی شہپاروں کے ساتھ ساتھ نیم سیاسی مواد بھی دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد "نقوش" کی ادارت محمد طفیل نے سنبھالی۔ اور یہ بھی ایک خالص ادبی رسالہ بن گیا۔ "ادبی دنیا" بحرانی دَور سے گذر کر سہ ماہی مجلّہ بن گیا۔ "ادب لطیف" پرانے راستے پر گامزن رہا۔ "ساقی" اور "عصمت" دہلی سے کراچی آ گئے۔ اس زمانے میں "ماہِ نو" کا اجرا، ہماری ادبی صحافت کے لئے خاصا مفید رہا۔

اردو رسالوں کی سوا سو سالہ تاریخ کا نہایت مختصر جائزہ میں نے اس لئے پیش کیا ہے۔ تاکہ آپ پر یہ حقیقت واضح کرسکوں کہ اردو رسالوں کا آغاز علمی صحافت کے طور پر ہوا۔ تاکہ قارئین کو مختلف علوم کی نئی تبدیلیوں اور نئے انداز سے آگاہ کیا جائے۔ پھر اردو رسالے علم و ادب کا امتزاج پیش کرنے لگے۔ اور اب ان میں صرف ادب باقی رہ گیا ہے۔ اور علم کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔

پچھلے پچاس سال میں مختلف علوم نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ تاریخ، معاشیات، نفسیات، عمرانیات اور علم السیاست کا دائرہ اتنا وسیع ہو رہا ہے۔ اور اس میں اتنی نئی چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔ جن کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ زمان و مکان کی قیود عملاً ختم ہو چکی ہیں۔ دوسری عالمی جنگ اور اس کے بعد مجلسِ اقوام کے قیام، بے شمار قوموں کی آزادی۔ کئی علاقوں میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف عوام کی بغاوت اور عالمگیر معاشی اور سیاسی اصولوں کے

درمیان کشمکش نے ان معلومات کا دائرہ بے حد وسیع کر دیا ہے۔ جو آج کے تعلیم یافتہ طبقہ کو مطلوب ہیں۔ فنونِ لطیفہ کی طرف آئیے۔ تو اس دائرے میں بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔ خود پاکستان میں اس کے گہرے اثرات ہمارے سامنے ہیں۔ آج سے پچیس تیس برس پہلے مصوروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ آج سینکڑوں مصور پیدا ہو چکے ہیں۔ اور آئے دن ان کی تخلیقات کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔ سنگتراشی کی طرف زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ فنِ تعمیر بالکل بدل چکا ہے۔ اور ہر تیسرے دن کوئی نہ کوئی ثقافتی شو منعقد ہوتا ہے۔ فلمی صنعت روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔ اور تھیٹر کا احیا، ہو رہا ہے۔ اس پس منظر کی روشنی میں آج کے رسائل دیکھئے گا۔ تو یوں محسوس ہو گا جیسے دنیا جہاں کھڑی تھی، وہیں بے حس و حرکت کھڑی ہے۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ مختلف علوم و فنون کے بارے میں مخصوص رسائل نکلنے چاہئیں۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر موجودہ ادبی رسائل بُحرانی دَور میں سے گذر رہے ہیں۔ تو مخصوص دلچسپی کے رسائل کتنے دن چلیں گے؟ اس مسئلے کا واحد حل یہی ہے۔ کہ ہمارے رسائل ادب کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ اور علومِ حاضرہ پر بھی توجہ دیں۔ اس سے اُن کی یکسانیت بھی ختم ہو گی۔ تنوع بھی پیدا ہو گا۔ اور ہم رسائل کے توسط سے اپنے قارئین کے ذہن و فکر کی مختلف ضروریات پوری کر سکیں گے۔

رسائل کی دنیا میں تین نئے تجربے اس قابل ہیں کہ ان کا خصوصیت سے ذکر کیا جائے۔ پہلا تجربہ "نقوش" کے خاص نمبروں کا ہے۔ اس رسالے نے شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، افسانہ نمبر، دہ سالہ نمبر، مکاتیب نمبر، پطرس نمبر، اور لاہور نمبر شائع کر کے نہایت بیش قیمت مواد پیش کیا ہے۔

اور نتیجہ ظاہر ہے کہ "نقوش" نے اپنے لئے ایک مقام پیدا کرلیا ہے دوسرے تجربے کے سزاوار ہمارے واجب الاحترام بزرگ اور اردو کے بہت بڑے خدمت گذار مولانا صلاح الدین احمد ہیں۔ انھوں نے خدا جانے کس دِقّت کے ساتھ سرمایہ جمع کرکے یہ سلسلہ شروع کیا ہے کہ تین سو صفحے کا ضخیم مجلّہ صرف ایک روپے میں پیش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ "ادبی دنیا" کی اشاعت پہلے سے چارگنا ہو گئی ہے۔ اور تیسرا تجربہ لاہور کے ایک چھوٹے سے رسالے "اردو ڈائی جسٹ" کا ہے۔ یہ اُن ڈائی جسٹ رسالوں کی طرح نہیں ہے۔ جو دوسرے رسالوں سے مضامین نقل کر لیتے ہیں۔ اس کا ادارۂ تحریر بڑی محنت سے مختلف النوع انگریزی، عربی اور اردو رسائل سے مضامین اخذ کرکے اُنھیں اپنی زبان میں پیش کرتا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی بہت متنوع ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی اشاعت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔

ان تجربات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے۔ کہ اگر ہم اپنے رسائل میں کوئی نئی بات پیدا کریں۔ تو عوام میں اس کا خیر مقدم ہوگا اور ہمارے رسلے اتنے کامیاب ہوں گے کہ ہمیں نہ تو سرکاری اشتہارات کے لئے دستِ سوال دراز کرنا پڑے گا اور نہ حکومت سے کسی اور صورت میں مدد مانگنی پڑیگی۔

اردو صحافت میں ٹائپ کا مسئلہ

برِعظیم پاک و ہند میں طباعت کا آغاز ۱۵۵۷ء میں اس وقت ہوا جب پرتگال کے عیسائی مشنریوں نے گوا میں پہلی کتاب چھاپی۔ بیس سال بعد جان گان سلیوز (JOHN GONSLAVES) نے تامل اور ملیالم زبانوں کے حروف ٹائپ میں ڈھالے اور "اصولِ مسیحیت" کے نام سے ایک کتاب چھاپی۔ اس کے بعد ایک سو سال کے عرصے میں جنوبی ہند میں چند چھاپہ خانے قائم ہوئے جنھوں نے تامل اور ملیالم ادب کی بعض کتابیں چھاپیں۔

حیرت کا مقام ہے کہ جہاں مغل حکمران حُسنِ ذوق کی بدولت ہر نئی چیز کی آؤ بھگت کرتے تھے۔ وہاں اُنھوں نے طباعت میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اُن کے عہد میں ادبی شہپاروں کو نقل کرنے کیلئے اعلیٰ درجے کے خطاط موجود تھے۔ نقول کی ایک محدود تعداد درکار تھی اس لئے طباعت کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ ریورنڈ جے۔ اوونگ ٹن نے ۱۶۸۹ء میں اس رائے کا اظہار کیا کہ فنِ طباعت میں مغلوں کی عدم دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اُن خطاطوں پر روزگار کا دروازہ بند نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جو

کتابیں اور فرامین نقل کرتے تھے۔

بنگالی زبان کا ٹائپ ۱۷۷۸ء میں ہگلی کے مقام پر سر چارلس ولکنز SIR CHARLES WILKINS کی نگرانی میں تیار ہوا۔ اور اس سے اگلے سال بنگالی زبان کی گرامر چھپی۔ سر چارلس نے ٹائپ ڈھالنے کا کام ایک ہندوستانی لوہار پنچن کو سکھایا۔

فارسی رسم الخط کے ٹائپ کا پتہ سب سے پہلے "کلکتہ گزٹ" سے چلتا ہے۔ جس کی اشاعت مورخہ ۴ مارچ ۱۷۸۴ء میں ایک کالم میں "خلاصۂ اخبارِ دربارِ معلیٰ بہ دار الخلافہ شاہ جہاں آباد" فارسی ٹائپ میں چھپا اور یہ سلسلہ کئی ہفتے تک جاری رہا۔

اس وقت فارسی اور عربی، دونوں قسم کے رسم الخط کے ٹائپ موجود تھے۔ "کلکتہ کرانیکل" کا ۱۷۹۰ء کا ایک فائل پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے ۱۸ مارچ کے شمارے میں اعلان درج ہے کہ ہمارے پاس فارسی اور عربی کے اعلیٰ درجے کے نہایت عمدہ اور متنوع ٹائپ کے حروف موجود ہیں۔ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ہم عنقریب نستعلیق ٹائپ میں دیوانِ حافظ کا ایک صحیح اور قابلِ اعتماد ایڈیشن چھاپیں گے۔ نستعلیق ٹائپ میں چھپائی کا نمونہ ۸ جولائی ۱۷۹۰ء کے "کلکتہ کرانیکل" میں صفحہ ۳ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں ایک اشتہار انگریزی، فارسی اور بنگالی میں درج ہے۔ اسی فائل میں نستعلیق ٹائپ کی چھپائی کے اور نمونے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ جہاں کسی فارسی کہانی کا انگریزی ترجمہ دیا جاتا تھا۔ وہاں ایک آدھ شعر یا قول فارسی میں بھی درج کر دیا جاتا تھا۔

آہستہ آہستہ دیسی حکمرانوں میں چھپائی کا ذوق پیدا ہوا اس کا ثبوت

اس بات سے ملتا ہے کہ جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی کمان میں برطانوی فوج نے آگرہ کے قلعۂ شاہی پر قبضہ کیا۔ تو مالِ غنیمت میں ایک چھاپہ خانہ بھی ہاتھ آیا۔ جس میں کسی مشرقی تصنیف کے لئے ٹائپ سیٹ ہو کر تیار تھا اور یہ ٹائپ نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔

فورٹ ولیم کالج اور ہیلی بری کالج کی تصانیف بھی اس ٹائپ میں شائع ہوتی تھیں اور ۱۸۲۹ء میں مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمۂ کلامِ پاک بھی ٹائپ میں شائع ہوا۔

برِعظیم پاک و ہند میں اردو اور فارسی کی مطبوعہ صحافت کا آغاز "جامِ جہاں نما" سے ہوا جو ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا" جامِ جہاں نما" ایک ایسے ٹائپ میں چھاپا جاتا تھا جسے نہ تو نستعلیق کہا جا سکتا ہے نہ نسخ۔ اس میں دونوں کی خصوصیات ملتی ہیں۔ اگر یہ بیان درست ہے کہ برِعظیم میں لیتھو طباعت کا آغاز ۱۸۳۶ء میں ہوا۔ تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ کلکتہ کے اخبار "مراۃ الاخبار" (فارسی)، "شمس الاخبار" (فارسی و اردو)، "آئینۂ سکندر" (فارسی) اور "سلطان الاخبار" (فارسی)، ٹائپ میں چھپتے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں "لدھیانہ اخبار" کے نام سے فارسی زبان میں لدھیانہ سے مشنریوں نے ایک اخبار جاری کیا۔ یہ بھی ٹائپ میں تھا۔

۱۸۳۶ء میں لیتھو کی طباعت نے برِعظیم میں قدم رکھا۔ چونکہ ٹائپ کی طباعت کے مقابلے پر اس میں لاگت کم آتی تھی۔ اس لئے اس کا رواج عام ہو گیا اور شمالی ہند کا سب سے پہلا اردو اخبار "دہلی اردو اخبار" لیتھو میں چھپتا تھا۔ یہی حال بہادر شاہ ظفر کے کورٹ گزٹ "سراج الاخبار" اور معاصر اخبارات کا تھا۔ بہرحال یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ٹائپ کی طباعت ناپید ہو گئی بعض اخبار بدستور ٹائپ میں چھپتے رہے۔ "جامِ جہاں نما" کے بارے میں

یکم اگست ۱۸۷۶ء کا "نصرت الاخبار" دہلی لکھتا ہے:

"جامِ جہاں نما۔ اب کلکتہ نما بھی نہیں رہا۔ زنگ نے کھالیا۔ ٹیپ کے چھاپے کو ہندوستانی خاص پسند نہیں کرتے۔ اور فارسی بھی کم سمجھتے ہیں۔"

سرسید احمد خاں

رفتہ رفتہ پرانا نستعلیق ٹائپ اور نستعلیق اور نسخ کا مِلا جُلا ٹائپ ناپید ہوگیا اور خالص نسخ ٹائپ کا دور دورہ ہوا۔ لیکن اِسے بھی اردو کے بہت تھوڑے جرائد نے اختیار کیا۔ سرسید احمد خاں نے جہاں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ میں نمایاں حصّہ لیا۔ وہاں سنجیدہ صحافت کے آغاز کا سہرا بھی اُن ہی کے سر ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ لیتھو کی طباعت صحافت کے لیے موزوں نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مقاصد کی اشاعت کے لئے جو رسالے نکالے وہ سب نسخ ٹائپ میں تھے۔ اس سے پہلے انھوں نے بعض انگریزی کُتب کے تراجم بھی ٹائپ میں چھاپے مثلاً ۱۸۶۵ء میں ROLLEN کی ANCIENT HISTORY OF GREECE کا ترجمہ "یونان کے قدیم زمانے کی تاریخ" کے نام سے چھاپا۔ مطبع کا نام سید احمد کا پرائیویٹ پریس تھا۔

۱۸۶۶ء میں موصوف نے "اخبار سائنٹفک سوسائٹی یا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مضمون اور خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اور طباعت نسخ ٹائپ میں ہوتی تھی۔ ۱۸۷۰ء میں انھوں نے "تہذیب اور اخلاق یا محمڈن سوشل ریفارمر" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ جو کبھی مہینے میں دوبار اور کبھی تین بار نکلتا تھا۔ یہ بھی نہایت خوب صورت نسخ ٹائپ میں چھپتا تھا۔

ابوالکلام آزاد اور محمد علی

اُنیسویں صدی کے آخر میں کلکتہ سے "حبل المتین" کے نام سے ایک ہفت روزہ فارسی جریدہ نکلا جس کی ادارت آقائے موید الاسلام کے ہاتھ میں تھی یہ ایران کی تحریکِ حریت کا علمبردار تھا۔ اور اس پرچے کی اشاعت برعظیم کے باہر بھی ہوتی تھی۔ "حبل المتین" نسخ ٹائپ میں چھپتا تھا۔ اس کا ۱۹۱۱ء کا فائل راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" جاری کیا جس میں تصاویر بھی شائع ہوتی تھیں۔ ۱۹۱۴ء میں مولانا آزاد نظر بند ہو گئے۔ تو "الہلال" بند ہو گیا۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد مرحوم نے "البلاغ" کے نام سے ایک اور ہفت روزہ جاری کر دیا۔ یہ بھی نسخ ٹائپ میں تھا۔ لیکن ۱۹۱۶ء میں اِسے بھی بند کر دینا پڑا۔

اسی زمانے میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم نے دہلی سے "ہمدرد" کے نام سے ایک روزنامہ نسخ ٹائپ میں چھاپنا شروع کیا۔ یہ برعظیم میں ٹائپ میں چھپنے والا پہلا روزنامہ تھا۔ مولانا مرحوم اپنی خود نوشت سوانح میں لکھتے ہیں:

"اردو کے لیے نستعلیق رسم الخط رائج ہے۔ جو اگرچہ نہایت خوب صورت ہے۔ اور خطاط اُس کی نوک پلک کو درست کر کے انتہائی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ٹائپ بنانے والوں کے لیے یہ رسم الخط مایوس کن حد تک الجھن پیدا کرتا ہے۔ عیسائی مشنریوں نے ان دونوں رسم الخط کے درمیان ایک ٹائپ بنایا جو نہایت بدنما تھا۔ نسخ میں بھی حروف بہت

بڑی تعداد میں درکار تھے۔ کیونکہ یہ رسم الخط حقیقت میں ایک طرح کا شارٹ ہینڈ ہے۔ سرسید احمد خاں نے کئی امور میں جدتیں پیدا کیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی نسخ ٹائپ استعمال کیا۔ لیکن اُن کی صحافت عام پسند صحافت نہیں تھی۔ اس لئے بہت کم لوگ اس سے مانوس ہوئے۔ ... میں درمیانی رسم الخط سے متنفر تھا۔ اور نستعلیق ٹائپ بن نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں نے بیروت سے نسخ ٹائپ منگوایا۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کہ لوگوں کو نستعلیق رسم الخط سے آزاد کرا کے نسخ سے مانوس کیا جائے۔"

اس کے بعد مولانا نے لکھا کہ اخبار کی اشاعت نہیں بڑھتی تھی دوستوں نے اصرار کیا کہ لیتھو طباعت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں جب "ہمدرد" لیتھو میں چھپنے لگا۔ تو اس کی اشاعت بڑھنے لگی۔

ادھر ۱۹۲۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" کو پھر جاری کیا اس مرتبہ سارا پرچہ ٹائپ میں نہیں چھپتا تھا۔ چند صفحے ٹائپ میں ہوتے تھے۔ اور چند لیتھو میں۔ ٹائپ بھی دو طرح کا استعمال ہوتا تھا۔ اوّل وہ جو نستعلیق اور نسخ کے بین بین تھا۔ اِسے اردو ٹائپ یا اردو حروف کہا جاتا تھا دوسرا نسخ یا عربی ٹائپ۔ مولانا آزاد نے جولائی کے مہینے میں صفحۂ اول پر ایک اعلان کرتے ہوئے قارئین سے استصواب آرا کیا۔ یہ اعلان دسمبر تک ہر ہفتے چھپتا رہا۔ اعلان کا متن ملاحظہ ہو:

"آج کوئی زبان ترقی نہیں کر سکتی اگر وہ اپنا ترقی یافتہ طریق طباعت نہیں رکھتی۔ طباعت کی ترقی اور تکمیل بغیر اس کے ممکن نہیں کہ حروف کی چھپائی اختیار کی جائے۔ پتھر کی چھپائی میں محدود

رہ کر اردو کی صحافت کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

" اردو کے سب سے بہتر حروف، جو اس وقت تک بن سکے ہیں۔ وہ ہیں۔ جن میں 'الہلال' چھپتا ہے۔ اور عربی کا بہترین خطِ نسخ وہ ہے، جس میں یہ سطریں کمپوز کی گئی ہیں۔ آپ ان دونوں میں سے جسے چاہیں پسند کرلیں۔ لیکن پتھر کی چھپائی سے اپنی زبان کو نجات دلائیں۔

" براہ عنایت اپنی اور اپنے دوستوں کی رائے سے ہمیں اطلاع دیجئے۔ یاد رکھیں۔ طباعت کا مسئلہ آج زبان و قوم کے لئے سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ ضروری ہے۔ کہ اس کے تمام نقائص ایک بار دور کر دیئے جائیں۔"

ہر ہفتے جتنی آرار آتیں۔ ان کے اعداد و شمار درج کر لئے جاتے تھے "الہلال" کے اس دور کا آخری پرچہ ۹ر دسمبر ۲۷ر کو نکلا۔ اس میں آرار کی کیفیت یہ تھی۔

لیتھو طباعت کے حق میں	۳۲۰
لیتھو اور ٹائپ دونوں کے حق میں	۸۰۲
اردو ٹائپ کے حق میں	۵۳۵
نسخ یا عربی ٹائپ کے حق میں	۲۵۵
نستعلیق ٹائپ کے حق میں	۱۹۰
میزان	۲۱۰۲

گویا دو ہزار ایک سو دو رائے دہندگان میں سے خالص لیتھو طباعت کے حق میں صرف تین سو بیس افراد تھے۔ آٹھ سو دو اشخاص چاہتے تھے کہ دونوں

قسم کی چھپائی ہو۔ اور نو سو اسی اشخاص صرف ٹائپ کی طباعت چاہتے تھے
بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں ٹائپ کی طباعت محدود پیمانے پر ہوتی رہی
مثلاً انجمن ترقیٔ اردو کی کتابیں نسخ ٹائپ میں چھپیں۔ ہندوستانی اکیڈیمی الٰہ آباد
نے بھی اپنی مطبوعات ٹائپ میں چھاپیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے
بعض کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں۔ رسالہ "اردو" "سائنس" اور "ہندوستانی"
نسخ میں چھپتے رہے۔ بعض ناشروں، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور مجلسِ
ترقیٔ ادب کی مطبوعات ٹائپ میں طبع ہوتی رہیں۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی
وقفے میں لاہور کے ہفت روزہ "دورِ جدید" کے چند صفحے نستعلیق ٹائپ میں
چھپتے تھے۔ یہ ٹائپ حیدر آباد دکن سے آیا تھا۔ بہت خوبصورت تھا۔ لیکن
جلی اتنا تھا کہ صفحے پر مواد بہت کم آتا تھا۔ آج کے دور میں پنجاب یونیورسٹی اور
بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی بعض مطبوعات اور اورنٹیل کالج میگزین سب
نسخ ٹائپ میں چھپتے ہیں۔ محکمۂ تعلیم نے نئی نسل کو نسخ سے مانوس کرنے کے لئے
تمام درسی کتب کے چند آخری صفحے ٹائپ میں چھاپنے کی رسم شروع کی۔ "امروز"
کسی زمانے میں ریڈیو پروگرام ٹائپ میں چھاپتا تھا۔ "جنگ" (کراچی)، اور
"تعمیر" (راولپنڈی)، بعض فیچر ٹائپ میں چھاپتے رہے ہیں۔ ہفت روزہ "قندیل"
کے چند صفحے ایک عرصے تک باقاعدہ ٹائپ میں چھپتے رہے۔ لیکن صحافت
کی دنیا میں ٹائپ کی طرف سب سے بڑا اقدام پاکستان ہیرلڈ پبلی کیشنز (کراچی)
نے اٹھایا تھا۔ اُس نے "ڈان" کا اردو ایڈیشن ٹائپ میں چھاپنا شروع کیا۔
یہ برِعظیم کا دوسرا اردو روزنامہ تھا۔ جس نے ٹائپ کی طباعت کو کاملاً اختیار
کیا۔ لیکن ایک تو ٹائپ بدنما تھا۔ دوسرے اس میں مواد بھی دلچسپ نہیں ہوتا
تھا۔ اس لئے اردو کا "ڈان" تھوڑے عرصے بعد بند ہو گیا۔ بعض لوگ ابھی تک

اس امید میں ہیں کہ ایسا نستعلیق ٹائپ ایجاد ہو جائے گا جو اخبارات اور رسائل بھی استعمال کر سکیں۔ لیکن یہ امید کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ اس کے راستے میں بڑی مشکلات ہیں۔ ان مشکلات کو جناب چودھری رحم علی الہاشمی نے اپنی کتاب "فنِ صحافت" میں یوں بیان کیا ہے:

"نستعلیق خط کی خوش نمائی کا دارومدار نوک پلک اور نشست پر ہے۔ اور یہ دونوں باتیں ٹائپ میں پیدا کرنا محال ہے۔ اس لئے کہ موٹے ٹائپ میں جوڑوں کا جو خط رکھا جائے گا وہ باریک ٹائپ میں سرے سے غائب ہو جائے گا۔ اور بہت چھوٹی قسم کے ٹائپ تو بن ہی نہیں سکیں گے۔ اس طرح نشست کا التزام ٹائپ کے حروف میں بالکل ناممکن ہے۔ اور اگر ایسے حروف بنائے بھی جائیں۔ جو ایک دوسرے کے اوپر چڑھائے جا سکیں تو وہ اوّل تو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جائیں گے۔ اور دوسرے ہر صورت میں یہ کار آمد نہ ہوں گے۔ اور کتابت کے اصول سے نشستِ الفاظ غلط ہو جائے گی۔ جو دیکھنے میں بھی بدنما معلوم ہو گی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جم بانجم یا مستعمل جیسے الفاظ کے لئے ایک ایک ٹائپ کی لمبائی میں کئی کئی جوڑ لگانے پڑیں گے جو کمپوز کرنے والوں کی دقتوں میں غیر معمولی اضافہ کر دیں گے۔ اس وقت تک جتنے نستعلیق ٹائپ ایجاد ہوئے ہیں وہ ان مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہوئے ہیں اور اس کے باوجود ان کے حروف اور جوڑوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ کمپوز کرنے والے کو سخت دشواری ہوتی ہے اور کمپوزنگ میں اتنی دیر لگتی ہے کہ تجارتی حیثیت سے یہ کامیاب

نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے نزدیک موجودہ مشکلات کے حل کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم اردو اخبارات کی طباعت کے لئے نستعلیق رسم الخط کو ترک کر کے نسخ رسم الخط کو اختیار کر لیں۔"

(صفحات ۲۲-۲۵)

جناب رحم علی الہاشمی نے نستعلیق ٹائپ کے سلسلہ میں جن مشکلات کا ذکر کیا ہے وہ ہاتھ سے کمپوز کرنے میں پیش آتی ہیں اور ظاہر ہے اخبار تو ہاتھ سے کمپوز کرنے والے ٹائپ میں نہیں چھپ سکتے۔ اس کے لئے وہ مشینی ٹائپ درکار ہے۔ جو مشین سے ایک ایک سطر کی صورت میں نکلتا ہے اور جسے LINO TYPE کہتے ہیں۔ اور مشینی ٹائپ میں نستعلیق حروف ڈھالنا ناممکن ہے۔ کیونکہ ان حروف کی جوڑائی میں وہ یکسانیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جو لائنو ٹائپ کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے نستعلیق ٹائپ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے۔ اس کا لائنو ٹائپ نہ ہونے کی وجہ سے اِسے اخباروں میں کبھی استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔ اخبارات کے لئے ہر نوع نسخ ٹائپ بھی کام آسکتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے دو سال بعد ادارہ مطبوعات "نوائے وقت" (لاہور) نے اردو ٹائپ کو فروغ دینے کی سعی کا آغاز کیا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ہفت روزہ قندیل کے آٹھ صفحے ٹائپ میں چھاپنے شروع کئے چند ماہ بعد "قندیل" پورے کا پورا ٹائپ میں طبع ہونے لگا۔ یہ سلسلہ پریس کی ضبطی کی وجہ سے منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد "قندیل" نصف ٹائپ میں اور نصف لیتھو میں چھپتا رہا۔ خود روزنامہ "نوائے وقت" کے بعض سپلیمنٹ ٹائپ میں چھپنے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ خوش نما، صاف

اور روشن ٹائپ بنوایا جائے ۔ اور اس میں روزنامہ " نوائے وقت" شائع کیا جائے ۔

" نوائے وقت" نے ۱۹۵۹ء میں اپنے درمیانی دو صفحے نسخ میں چھاپ کر اپنے قارئین سے دریافت کیا کہ آیا اُن کی رائے میں اردو صحافت میں ٹائپ کو رواج دینا چاہیئے یا نہیں ۔ اگر جواب اثبات میں ہو تو آیا اسے فوراً رائج کر دیا جائے یا بتدریج ۔ یا قارئین اس بات کے قائل ہیں کہ اردو اخبار بدستور لیتھو طریق طباعت کے مطابق چھپتے رہیں ۔ اس کے بعد انہی خطوط پر ایک باقاعدہ سوالنامہ چھاپ کر اپنے قارئین کو بھیجا ۔ اور اُن سے کہا کہ نہ صرف سوالات کے جواب لکھیں ۔ بلکہ اپنے مشورے یا تجاویز بھی مختصراً قلمبند کر دیں ۔ اس سوال نامے میں قارئین نے اتنی دلچسپی لی کہ اس کی مثال برعظیم پاک و ہند میں کہیں نہیں ملتی ۔ کل تین ہزار چار سو تراسی اشخاص نے جواب بھیجے ۔ ان میں اڑتیس جواب ایسے تھے ۔ جن سے رائے دہندگان کا عندیہ معلوم نہ ہوسکا اس لئے انھیں شمار نہیں کیا گیا ۔ باقی تین ہزار چار سو پینتالیس جوابات سے رائے شماری کی گئی ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ۔

جو لوگ ٹائپ کے حق میں ہیں	۲۴۶۳
جو لوگ لیتھو کے حق میں ہیں	۹۸۲
	۳۴۴۵

اس سے ظاہر ہوا ۔ کہ لوگوں کی غالب اکثریت ٹائپ کی حامی ہے اور لیتھو کے حامیوں کی تعداد بہت کم ہے ۔ اب سوال یہ تھا کہ ٹائپ کے حامی اسے فوراً رواج دینا چاہتے ہیں یا بہ تدریج ؟ اس مسئلے پر آراء کی تعداد ملاحظہ ہو :

فوراً رواج دینے کے حامی ۲۷۰

بہ تدریج رواج دینے کے حامی ۲۱۹۳

۲۴۶۳

زیادہ سمجھ دار طبقے نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا کہ وہ اپنی تجاویز پیش کرے۔ ان کی تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔ نسخ ٹائپ قبول ہے لیکن اسے بہتر بنایا جائے ۱۰۸

۲۔ نستعلیق ٹائپ کو رواج دیا جائے ۵

۳۔ رومن رسم الخط اختیار کرکے اس کا ٹائپ رائج کیا جائے ۲

۴۔ تصویریں چھاپنی ہوں تو ٹائپ رائج کر دیا جائے۔ ۵۳

۵۔ اگر سارے اخبار ٹائپ کی طباعت اختیار کریں تو "نوائے وقت" بھی یہی کرے۔ ۲۸

۶۔ درمیانی دو صفحے ابھی سے ٹائپ میں چھاپے جائیں ۵۸

۷۔ درسی کتابیں بھی ٹائپ میں چھاپی جائیں ۴۴

بعض انفرادی آراء ایسی تھیں کہ ان کا ذکر ضروری ہے۔ ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ پڑھے لکھے طبقے کے ممتاز افراد کو ایک مجلس مذاکرہ میں بلایا جائے۔ اور وہاں اس مسئلے کے حسن و قبح پر پورا غور کرکے فیصلہ کیا جائے۔ کچھ لوگ چاہتے تھے۔ کہ ٹائپ رائج کرنے سے پہلے اس کے لئے وسیع پیمانے پر پبلسٹی کی جائے۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ ٹائپ سے صحافت اور ادب کو کیا کیا فائدے پہنچیں گے۔ ایک کہنہ مشق اور بزرگ صحافی نے لکھا۔ "پہلے سررشتۂ تعلیم نصابی کتب کو ٹائپ میں چھاپے تاکہ آئندہ نسل ٹائپ کو پڑھنے کے لئے بالکل تیار ہو جائے۔ اس کے بعد کل کتابوں، رسالوں اور اخباروں کو

ٹائپ میں منتقل کرنا نہ صرف ممکن بلکہ ضروری ہو جائے گا۔ اس دوران میں اخباروں اور رسالوں کو آہستہ آہستہ بہ تدریج ٹائپ رائج کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ تاکہ موجودہ نسل بھی اس کی عادی ہوتی چلی جائے" ٹائپ کو فوراً رائج کرنے کے ایک حامی نے لکھا: "ٹائپ کی مخالفت میں آراء پڑھ کر ناقابلِ بیان تکلیف ہوتی ہے۔ اگر یہ لوگ اس ایٹمی دور میں بھی پتھر کے زمانے کی باتیں کرتے ہیں۔ تو ہمیں لامحالہ اُنھیں پیچھے چھوڑ کر ترقی کی جانب بڑھنا ہوگا۔ انھیں چیخنے چلاتے دیجیے۔ اور آگے بڑھیے۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہ لوگ بھی ٹائپ کی افادیت کے قائل ہو جائیں گے۔ شروع میں ممکن ہے۔ آپ کو مالی طور پر کچھ نقصان بھی برداشت کرنا پڑے۔ لیکن آپ کی یہ قربانی قوم ہمیشہ یاد رکھے گی۔" ایک خاتون نے لکھا کہ ہم پڑھے لکھے لوگ تو ٹائپ پسند بھی کرتے ہیں اور اسے پڑھ بھی سکتے ہیں لیکن کم تعلیم یافتہ لوگ اس میں بڑی دقّت محسوس کریں گے۔ اس کے برعکس رائے ایک ایسے صاحب نے پیش کی۔ جنھیں دعویٰ تھا۔ کہ وہ دس سال سے کتابوں کے کاروبار میں مشغول ہیں اور ملک کے مختلف حصوں میں گھوم چکے ہیں ان کے تاثرات یہ تھے: "میں نے دیکھا ہے کہ عام طور پر ٹائپ کے مخالف وہ لوگ ہیں جن کی عمر کا بیشتر حصہ شہروں میں گذرا ہے۔ اور جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اور اب زندگی کے آخری سانس لے رہے ہیں۔ دوسری طرف اکثریت دیہات میں ہے۔ یہ لوگ اپنی محدود تعلیم کے باوجود ٹائپ پسند کرتے ہیں کیونکہ ان کا ذریعۂ تعلیم قرآنِ مجید ہے۔

ٹائپ کے مخالفین کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ کاتب بے کار

ہوجائیں گے۔ یہ دلیل قوی نہیں تھی۔ کیونکہ محض ایک چھوٹے سے گروہ کی بے کاری کے خوف سے اردو صحافت کی ترقی کو مسدود کرنا مستحسن نہیں۔ پھر یہ خدشہ بھی نہیں تھا کہ سب کاتب بیکار ہوجائیں گے۔ کیونکہ ابتداء میں صرف چند اخبار ٹائپ میں منتقل ہوتے۔ ٹائپ کے مخالفین کی دوسری بڑی دلیل یہ تھی کہ فن خوشنویسی اور فن خطاطی کو زوال ہوگا۔ حالانکہ مغلوں کے زوال کے ساتھ ساتھ ان فنون کا زوال ہوا۔ اور یہ اسی وقت سے برابر زوال پذیر ہیں۔ اہل نظر جانتے ہیں۔ کہ عبدالمجید پرویں رقم کا انتقال ہوا۔ تو اُن کے بعد ویسا خطاط پیدا نہ ہوا اور تاج الدین زریں رقم اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ تو آج اُن کے پائے کا بھی خطاط نہیں ملتا۔ نیز چند اخبارات کے ٹائپ میں طبع ہونے سے کونسی بڑی آفت آجائے گی؟ ٹائپ کے خلاف ایک اور دلیل یہ تھی کہ اِسے پڑھنے سے ذہن پر دباؤ پڑتا ہے۔ لیکن یہ دباؤ تو محض نفسیاتی ہے۔ اگر نظر عادی ہوجائے تو پڑھنے میں قطعی طور پر کوئی اُلجھن محسوس نہ ہو۔

لیتھو کی طباعت میں نقصان

لیتھو کے طریقِ طباعت نے اردو صحافت کو خاصا نقصان پہنچایا ہے سب سے پہلے تازہ ترین خبروں کی اشاعت کو لیجئے۔ قارئین نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات آخری وقت پر آنے والی بعض اہم خبریں انگریزی اخباروں میں موجود ہوتی ہیں لیکن اردو اخبارات میں نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لیتھو پر چھپنے والے اردو اخبارات میں رات کے ایک یا ڈیڑھ بجے کام ختم ہوجاتا ہے۔ اور انگریزی اخبارات میں صبح چار بجے تک کام جاری رہ سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لیتھو طباعت سست رفتاری سے

ہوتی ہے۔ اور ٹائپ کی طباعت تیز رفتاری سے۔ لیتھو کی جو روٹری مشینیں ہمارے ہاں نصب ہیں۔ یہ بالکل زائدالمیعاد اور فرسودہ ہو چکی ہیں یہاں تک کہ پچھلے پینتیس برس سے یورپ کے کارخانوں میں یہ مشینیں بننا بند ہو گئی ہیں۔ اور جو مشینیں یہاں نصب ہوتی ہیں RE-BUILT یا "اودرہال" کی ہوئی مشینیں ہیں۔ بہت اچھی مشین ایک گھنٹے میں دو ہزار کاپیاں چھاپتی ہے۔ گویا اگر کسی اخبار کی اشاعت بیس ہزار ہے۔ تو ایک مشین پر وہ اخبار دس گھنٹے میں چھپے گا۔ اگر ایک بجے رات کے کام ختم ہو جائے تو چار ساڑھے چار بجے تک پرچہ مارکیٹ میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے کم از کم تین مشینوں پر بیک وقت چھاپا جائے۔ اور اس کے لئے لازم ہے کہ باقی دو مشینوں کے لئے "دو چربے نکالے جائیں اور چربوں کی چھپائی اصل کتابت شدہ کاپی کی چھپائی سے پست معیار کی ہوتی ہے۔ گویا ایک طرف تو اخبار ایک بجے سے بعد کی خبروں سے محروم رہتا ہے۔ دوسرے چھپائی بھدی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے پر انگریزی اخبار میں کام تین ساڑھے تین بجے تک جاری رہتا ہے۔ اس وقت تک آئی ہوئی سب خبریں شامل ہوتی ہیں۔ اس کے بعد سلنڈر والی بڑی روٹری پر سارا اخبار بیک وقت بیس ہزار پرچہ فی گھنٹہ کی رفتار سے چھپ جاتا ہے۔ اور اگر چھپائی کے دوران میں بھی کوئی اہم خبر آئے تو مشین بند کر کے فوراً سٹاپ پریس کی خالی جگہ میں وہ خبر درج کر دی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد چھپنے والے اخبار میں وہ خبر بھی شامل ہو جاتی ہے

یہ درست ہے کہ بہتر مواد اور حسن ترتیب میں کارکنوں کی قابلیت کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں چھپائی کا طریقہ بھی حائل ہے

مثلاً تصاویر اور کارٹونوں کی اشاعت لیتھو کی طباعت میں ممکن نہیں۔ اگر تصاویر کے بلاک بنوا کر اُن کے چربے لگائے جائیں۔ تو تصاویر اتنی بھدی چھپتی ہیں کہ اس سے نہ چھاپنا بہتر ہے۔ جو اردو اخبار لیتھو پر چھپنے کے باوجود صاف ستھری تصاویر چھاپ لیتے ہیں انھیں اخبار دو بار چھاپنا پڑتا ہے۔ ایک بار تصاویر کے بلاک چھاپنے کے لئے اور دوسری بار عبارت کی طباعت کے لئے۔ اس میں یہ قباحت ہے کہ ایک تو چھپائی کی لاگت دوہری ہو جاتی ہے۔ دوسرے اتنی تاخیر ہو جاتی ہے۔ کہ اہم خبری تصاویر News Photos وقت پر نہیں چھپ سکتیں وہ چھپنے کے دوسرے دن اخبار میں آتی ہیں۔ اور ظاہر ہے اُن کی اشاعت کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ لیتھو پر چھپنے والے اردو اخبارات میں شاذ ہی کوئی اچھا کارٹون چھپتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خطوط کے تیکھے پن سے بات پیدا ہوتی ہے۔ اور تیکھا پن اُس وقت تک نہیں آتا۔ جب تک کارٹونسٹ اِسے کالی روشنائی سے بڑے پیمانے پر نہ بنائے۔ اور بڑے کارٹونوں سے چھوٹا بلاک نہ بنایا جائے۔ کیونکہ بڑی چیز سے چھوٹا بلاک ہمیشہ اچھا بنتا ہے۔ اور بلاک کی چھپائی بلاک ہی سے ہو۔ تو کارٹونسٹ کا مافی الضمیر ہمارے سامنے آسکتا ہے۔ لیتھو پر چھپنے والے اردو اخباروں میں کارٹونسٹ کتابت کے کاغذ پر کتابت کی روشنائی سے کارٹون بناتا ہے۔ اس سے اول تو خطوط میں تیکھا پن نہیں آتا۔ اور اگر آ بھی جائے تو چھپائی میں آکر غائب ہو جاتا ہے۔ کم وبیش یہی حال بلاک سے چربہ بنا کر چھاپنے سے ہوتا ہے۔ گویا اچھے کارٹونوں اور سکیچوں اور نقشوں کی

اشاعت کا انحصار بھی اسی بات پر ہے کہ لیتھو کے طریقِ طباعت کو ترک کر دیا جائے۔

"لیل و نہار" نے ایک نیا راستہ نکالا۔ لیتھو طریقِ طباعت خارج از بحث تھا۔ اور ٹائپ کی طباعت میں بڑی رکاوٹیں حائل تھیں اس لئے "فوٹو آفسٹ" کا طریقِ طباعت اختیار کیا۔ اس سے نستعلیق رسم الخط کا حسن بھی برقرار رہا۔ اور تصاویر، کارٹون وغیرہ چھاپنے بھی آسان ہو گئے۔ لیکن ایک عرصے تک روزانہ اخبار اسے اختیار کرنے سے ہچکچاتے رہے اور اُس کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ اوّل اس میں طباعت کے اخراجات بہت بڑھ جاتے ہیں۔ دوسرے اس میں وقت بہت لگتا ہے۔ جو ایک روزنامہ اخبار کے لئے سمِّ قاتل ہے۔ کیونکہ وہاں تو ہر کام تیز رفتاری سے ہوتا ہے۔ آخر "امروز" نے پہلے "قسمتِ علمی و ادبی" آف سیٹ سے چھاپنی شروع کی۔ (اگرچہ اولیت کا سہرا "ملّت" کو ہے۔ جو مدت ہوئی بند ہو چکا ہے) اس پر "کوہستان" نے بھی ایسا ہی کیا۔ اور "نوائے وقت" نے بھی۔ پھر ان اخباروں میں مسابقت کا دَور شروع ہوا۔ اب "جنگ" "حریت" "امروز" اور "کوہستان" پورے کے پورے آفسٹ یا "دین ڈانگ" طریقِ طباعت کے مطابق چھپتے ہیں۔ اور "نوائے وقت" کا غالب حصہ اسی طرح چھپتا ہے۔ "جنگ" اور "امروز" نے "شہ رنگ" آف سیٹ روٹری درآمد کر کے نصب کرائی ہیں۔ ان مشینوں پر ایک گھنٹے میں پندرہ ہزار پرچے پورے کے پورے بیک وقت چھپ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب یہ اخبار انگریزی اخباروں کے مقابلے پہ تازہ خبریں دینے پر تقریباً قادر ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انگریزی اخباروں میں چھاپتے چھاپتے

مشین روک کر سٹاپ پریس کی جگہ میں تازہ ترین خبر دی جا سکتی ہے۔ اور آف سیٹ میں ایسا ممکن نہیں۔ یہاں کوئی نئی خبر دینی ہو، تو پوری کاپی نئی بنانی پڑے گی۔

آف سیٹ کے اختیار کرنے سے اب اردو صحافت میں ٹائپ کی طباعت کا معاملہ دور جا پڑا ہے۔ کیونکہ اب بہ ظاہر اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔

قائدِ اعظم اور اسلامی صحافت

برِعظیم کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اور تحریکِ پاکستان کی کامیابی میں اسلامی صحافت نے جو نمایاں حصہ لیا۔ وہ مورخین کی نظر سے پوشیدہ نہیں اور یہ بھی ایک جیتی جاگتی اور مسلّم حقیقت ہے کہ اسلامی صحافت کی نشو و نما اور استحکام میں قائدِ اعظم نے جو کردار ادا کیا اُسے کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی مساعی سے کئی نئے اخبار جاری ہوئے۔ جنھوں نے پہلے سے موجود اخباروں کی رفاقت میں تحریک کا پیغام عوام تک پہنچایا۔ اور ان کے قلوب کو گرمایا اور تڑپایا۔ یہاں تک کہ پوری ملتِ اسلامیہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی۔ اور وہ سب عناصر ایک ایک کر کے مٹ گئے۔ جو اسلام کا نام لے کر تحریکِ پاکستان کے راستے میں حائل تھے۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ آج پاکستان میں صحافت کی جو ترقی نظر آتی ہے۔ اُس کی بنیاد بھی قائدِ اعظم کے مبارک ہاتھوں سے ڈالی گئی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں جب اسلامی صحافت کا گھروندا خاکستر ہوا۔ تو اس کی راکھ پر ایک نیا قصر تعمیر ہوا۔ اس کی بنیاد سرسید احمد خاں

نے دکھی ان کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" نے اسلامی معاشرہ میں اصلاح کی مہم چلائی اور "اخبار سائنٹنک سوسائٹی" نے مسلمانوں کی نیم سیاسی رائے عامہ کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دیئے۔ انہی اخباروں کے زیرِ اثر برعظیم کے طول وعرض میں چھوٹے چھوٹے مسلمان اخبار اور رسالے اُبھر آئے۔ جن میں لاہور کا "پیسہ اخبار" اور "وطن" خاص طور پر نمایاں تھے۔ ابو الکلام آزاد۔ محمد علی اور ظفر علی خاں نے اسلامی صحافت کو عظمت اور رفعت عطا کی اور اس کے شکوہ میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ اور جب تحریکِ خلافت کے بعد مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی جنگ چھڑی تو اس میں جوش وخروش کے ساتھ ساتھ منطق اور دلیل کے عناصر بھی داخل ہوئے۔ اس دور میں لاہور میں "انقلاب" اور "سیاست" دہلی میں "ہمدرد" "وحدت" اور "الامان" لکھنؤ میں "حق" اور "ہمدم" اور کلکتہ میں "عصرِ جدید" نے علیحدگی کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے جو مسلسل خدمات سرانجام دیں۔ وہ اہلِ نظر پر واضح ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسلامی صحافت میں وہ قوت موجود نہیں تھی۔ جو غیر مسلم صحافت میں موجود تھی۔ اس لئے جہاں پروپیگنڈے کی ضرورت ہوتی۔ اسلامی صحافت مات کھا جاتی تھی۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اُن کا کوئی اعلیٰ پائے کا انگریزی اخبار موجود نہیں تھا۔ لاہور کا "مسلم آؤٹ لک" ۱۹۳۲ء میں بند ہوگیا۔ تین سال بعد "ایسٹرن ٹائمز" جاری ہوا۔ جو بے حد کمزور اور نحیف تھا۔ دوسرے شہروں میں دو تین ہفت روزہ انگریزی اخبار تھے اور بس اس کے مقابلے پر کانگرس اور دوسرے غیر مسلم عناصر کے کئی کثیر الاشاعت

اخبار تھے۔ جن میں "ہندوستان ٹائمز"، "نیشنل کال" "ٹریبیون" "امرت بازار پتر کا" "ہندو" اور "بمبئی کرانیکل" نمایاں تھے۔ یہ اخبار شب و روز مسلم لیگ کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے تھے۔ بڑے بڑے اینگلو انڈین اخبار مثلاً "سول اینڈ ملٹری گزٹ" "سٹیٹسمین" "ٹائمز آف انڈیا" اور "پائونیر" موجود تھے۔ لیکن وہ بھی مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ پیش کرنے میں خسّت سے کام لیتے تھے۔ گویا مسلم لیگ کے لئے کوئی ایسی صورت نہیں تھی۔ کہ اُس کے خیالات حکمران طبقے اور تعلیم یافتہ افراد تک پہنچے۔ طرہ یہ کہ ملک کے دو بڑے خبر رساں ادارے ایسوشی ایٹڈ پریس اور یونائیٹڈ پریس آف انڈیا۔ عملاً ہندوؤں کے قبضے میں تھے۔ اور وہ قدرتی طور پر مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ نشر کرنے میں متامل تھے۔ یہ تھا ہماری صحافت کا حال۔ جب صوبائی خود مختاری کی آمد آمد تھی اور مسلم لیگ ایک نئی انقلابی اور عوامی کروٹ لینے کو تھی۔

اس دور میں مسلمان زیادہ شدّت سے محسوس کرنے لگے کہ ملّی نشاۃِ ثانیہ کے لئے اسلامی صحافت کو مضبوط بنانا ضروری ہے۔ چنانچہ کلکتہ سے "اسٹار آف انڈیا" کے نام سے ایک انگریزی روزنامہ جاری کیا گیا۔ اور لاہور سے ملک برکت علی مرحوم نے "نیو ٹائمز" جاری کیا۔ لیکن اسلامی صحافت کی حیاتِ نو کا آغاز اُس وقت ہوا جب حضرتِ قائدِ اعظم نے اس میں سرگرمی سے دلچسپی لی۔ وہ خود اخبار نویس نہیں تھے۔ لیکن اچھی طرح جانتے تھے کہ رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لئے صحافت ہی واحد ذریعہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار اس بات پر زور دینے لگے۔ کہ اسلامی صحافت کو تقویت دی جائے جو اخبار موجود تھے۔ ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کرتے تھے حتیٰ کہ لاہور کے ایک مسلمان اخبار نے جب ہٹلی پر نشر نصب کیا تو قائدِ اعظم نے یہ جانتے

ہوئے بھی اس کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی کہ ہندو اخبار اس کا مضحکہ اڑائیں گے۔ کیونکہ ان میں ہر ایک کے پاس ٹیلی پرنٹر موجود تھا۔ قائدِ اعظم کا مقصود صرف یہ تھا کہ ایک مسلمان اخبار کی حوصلہ افزائی کیجائے۔

جب قرار دادِ پاکستان منظور ہوئی تو قائدِ اعظم نے اسلامی صحافت کو استحکام بخشنے کے لئے عملی قدم اُٹھایا۔ اُنھوں نے چندے کی مہم شروع کی اور جو سرمایہ جمع ہوا۔ اس سے "ڈان ٹرسٹ" قائم کیا۔ اور اس طرح اُن کی براہِ راست نگرانی میں دہلی سے روزنامہ "ڈان" جاری ہوا۔ دوسری عالمگیر جنگ جاری تھی۔ اخباری کاغذ کی بے حد قلت تھی۔ ابتدا میں "ڈان" کے پاس اپنا پریس بھی نہیں تھا۔ اور انگریزی زبان میں تربیت یافتہ مسلمان صحافیوں کی کمی کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ اُنھیں انگلیوں پر گِنا جاسکتا تھا یہاں تک کہ "ڈان" کے ابتدائی دور میں اس کی ادارت ایک عیسائی صحافی پوتھن جوزف کے سپرد کرنا پڑی۔ اس کے باوجود "ڈان" مقبول ہوا۔ اور اُس نے بیش قیمت خدمات سرانجام دیں۔ اس کے ساتھ ہی قائدِ اعظم ہی کی تحریک پر کلکتہ سے "مارننگ نیوز" جاری ہوا۔ جو آج کل بیک وقت ڈھاکہ اور کراچی سے نکلتا ہے۔ قائدِ اعظم نے یہ بھی محسوس کیا کہ نئے اخبار جاری کرنے کے باوجود مسلمانوں کی آواز میں اُس وقت تک قوت پیدا نہیں ہوگی۔ جب تک اُن کی اپنی خبر رساں ایجنسی قائم نہیں ہوگی۔ چنانچہ اُن کے ایماء پر بہار کے چند مسلمان زعماء نے "اورینٹ پریس آف انڈیا" کے نام سے ایک مسلم خبر رساں ایجنسی قائم کی۔ جس کے دفاتر ہندوستان بھر کے بڑے بڑے شہروں میں قائم ہوگئے۔ اس طرح مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں زیادہ منظم انداز میں منظرِ عام پر آنے لگیں۔ دہلی سے آل انڈیا مسلم لیگ

کے زیرِ اہتمام روزنامہ "منشور" جاری ہوا۔ لاہور میں "نوائے وقت" ہفت روزہ سے روزانہ ہوا۔ کراچی، بمبئی اور الٰہ آباد سے ہفت روزہ انگریزی جرائد شروع ہوئے۔ لکھنؤ سے چودھری خلیق الزماں نے "تنویر" کے نام سے ایک اردو روزنامہ جاری کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانانِ ہند کی آواز زیادہ گھن گرج کے ساتھ سنائی دینے لگی۔ اور ہندو اخباروں کے پروپیگنڈے کا جواب موثر انداز میں دیا جانے لگا۔ اور نام نہاد قوم پرست اخبارات نے ایسی مات کھائی کہ اُنھیں کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ اور جب قیامِ پاکستان سے سات مہینے پہلے قائدِ اعظم کی سرپرستی میں "پاکستان ٹائمز" جاری ہوا تو مسلمانوں کی آواز میں اور بھی زیادہ قوت پیدا ہو گئی۔ اور آخرِ کار مسلمان اپنی منزل پہ پہنچ گئے۔

قائدِ اعظم "ڈان" کے مینجنگ ٹرسٹی تھے۔ لیکن کارکن صحافیوں کے کام میں بے جا مداخلت کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ ۱۵ر نومبر ۴۶ء کو "ڈان" کے بارے میں ایک بیان دیتے ہوئے آپ نے کہا۔

"اکثر کہا جاتا ہے کہ 'ڈان' میرا اخبار ہے اور کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 'ڈان' میں سب کچھ میرے کہنے پر یا مسلم لیگ کی ہدایت کے مطابق لکھا جاتا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ کاملاً غیر صحیح ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 'ڈان' مسلم لیگ کی پالیسی پہ چلتا ہے لیکن یہ ایک ٹرسٹ ہے۔ مسلم لیگ کی ملکیت نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹرسٹی کی حیثیت میں ٹرسٹ کا انتظام کرتا ہوں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ٹرسٹی کی حیثیت سے یا کسی اور حیثیت سے میں نے کبھی ایڈیٹر کے کام

میں مداخلت نہیں کی۔ بہر حال اگر یہ اخبار مسلم لیگ کی پالیسی سے
بنیادی طور پر انحراف کرے تو ایسی صورت میں قدرتی طور پر مداخلت
کروں گا۔"

صحافت کے بارے میں قائدِ اعظم کا نظریہ واضح کرنے کے لئے میں دو مختصر اقتباس پیش کروں گا۔ "ڈان" کی پہلی سالگرہ یعنی ۱۲ اکتوبر ۴۳ء کو آپ نے ایک پیغام میں کہا:

"قوم کی ترقی اور بہبود کے لئے صحافت ایک اہم ضرورت ہے۔ کیونکہ زندگی کے تمام شعبوں میں سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کے لئے صحافت ہی وہ واحد ذریعہ ہے۔ جو قوم کی رہنمائی کرتی ہے اور رائے عامہ کو تشکیل دیتی ہے۔"

کشمیر کے صحافیوں سے ایک ملاقات کے دوران ۲۳ مئی ۴۴ء کو قائدِ اعظم نے فرمایا:

"صحافت ایک عظیم طاقت ہے۔ یہ فائدہ بھی پہنچا سکتی ہے اور نقصان بھی۔ اگر یہ صحیح طریقے پر چلائی جائے تو یہ رائے عامہ کی رہنمائی اور ہدایت کا فرض انجام دے سکتی ہے۔"

قائدِ اعظم کا یہ قول آج کے دور میں خاص طور پر ہمارے لئے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔ جب صحافت تجارت بن رہی ہے۔ اور اشاعت بڑھانے اور ایک دوسرے کو مات دینے کے جنون میں ہمارے بعض اخبار اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کو بھول رہے ہیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے کہ حقیقی اور سنجیدہ صحافت اور سنسنی خیز صحافت کے درمیان وہی فرق ہوتا ہے۔ جو ایک حیادار خاتون اور ایک طوائف

میں ہوتا ہے۔ حیا دار خاتون اپنے سگھڑ پن اور نیکی میں رہتی ہے
اور طوائف اپنی عشوہ طرازی سے ہر ایک کو مسحور کر لیتی ہے۔ لیکن
اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا حماقتِ عظمیٰ سے کم نہیں کہ طوائف حیادار
خاتون سے بہتر ہے۔

اضلاعی اخبارات کا مستقبل

پاکستان میں صحافت نے گذشتہ سولہ برس میں جو ترقی کی ہے۔ اُس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ کہاں یہ حالت تھی کہ آزادی سے پہلے پاکستانی علاقوں میں صرف لاہور اور کراچی صحافتی مرکز تھے۔ اور کراچی سے بھی بہت کم اخبار نکلتے تھے۔ کہاں یہ حالت ہے کہ لاہور، کراچی اور ڈھاکہ نہایت اہم صحافتی مرکز بن گئے ہیں۔ یہی نہیں، پشاور، راولپنڈی، لائل پور، ملتان، حیدر آباد سندھ اور چاٹگام بھی روزانہ صحافت کے مرکز بن گئے ہیں۔ حُسنِ ترتیب، کتابت، نئے اندازِ طباعت، خبروں کی فراہمی اور دلچسپ اور مفید فیچروں کی اشاعت میں بھی ہماری صحافت کی ترقی بہت نمایاں ہے۔ اور ہمارے اخباروں نے اتنی بڑی اشاعتیں بنالی ہیں جن کا تصور قیام پاکستان کے وقت ناممکن تھا۔

بہرحال ہماری صحافت کا ایک شعبہ ایسا ہے جس میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ بلکہ شاید زوال کے آثار زیادہ ہیں۔ اور وہ اضلاعی اخبارات کا شعبہ ہے۔ قومی اور علاقائی اخبارات کی تعداد اور اشاعت میں اضافے

کے باوجود اضلاعی صحافت کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے معاشرے میں اضلاعی اخبار بہت بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان کا رقبۂ اثر محدود ہوتا ہے۔ اس لیے یہ عوام سے قریب حاصل کر کے مقامی مسائل کو منظرِ عام پر لا سکتے ہیں۔ ان پر تفصیل سے اظہارِ رائے کر سکتے ہیں۔ اور چاہیں تو عوام میں صحیح جمہوریت کا ذوق تخلیق کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ اور ایک لحاظ سے عوام کے لئے اضلاعی اخبار قومی اور علاقائی اخباروں کے مقابلے پر زیادہ مفید ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ جتنی تفصیل سے وہ مقامی خبریں درج کر سکتے ہیں اور مقامی مسائل کا پس منظر واضح کر سکتے ہیں ویسی تفصیل سے قومی اور علاقائی اخبار یہ خدمت انجام نہیں دے سکتے۔

بدقسمتی سے ہمارے اضلاعی اخباروں کا معیار مجموعی طور پر پست ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اخباری کاغذ پاکستان میں بننے کے باوجود نہ صرف کمیاب ہے بلکہ گراں بھی ہے۔ طباعت کے اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ ملک بھر میں اشیاء کی ہوش ربا گرانی کی وجہ سے اخبار نویسوں کو بھی زیادہ تنخواہ کی ضرورت ہے۔ چونکہ مشاہرے کم ہیں۔ اس لیے اضلاعی اخباروں کی طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ صحافی توجہ نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میدان زیادہ تر اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کی تعلیم کم ہے۔ اور معلومات کا دائرہ محدود۔ ان سے صحافت کے اعلیٰ معیار کی توقع رکھنا عبث ہے۔ پھر زیادہ تر اضلاعی اخبار نویس اپنے اخبار کو "بڑا اور اہم" بنانے کے لئے اُن میں ایسا مواد درج کر دیتے ہیں۔ جن کا اضلاعی عوام سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔ عملے کی کمی اُنھیں مجبور کر دیتی ہے۔ کہ وہ ہر قسم کا رطب و یابس

درج کر دیں۔ مثلاً غیر ملکی سفارتوں کے اطلاعاتی محکموں کے مہیا کئے ہوئے بے شمار مضامین۔ بلکہ ایک سفارت خانے کا اطلاعاتی محکمہ تو مضامین کے چربے بھیج کر کاتب کا خرچ بھی بچا دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ مضامین قارئین کے کام نہیں آتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اضلاع کے لوگ اضلاعی اخباروں کو خریدنا بے سود سمجھتے ہیں۔ چونکہ ان کی اشاعت کم ہوتی ہے۔ اس لئے مقامی تاجر اشتہار نہیں دیتے اور جب اخبار نقصان پر چلے۔ تو ظاہر ہے وہ ایسی تدابیر پر اُتر آئے گا۔ جو نہ صرف صحافتی اُصول بلکہ عام اخلاقی اصول کے بھی منافی ہیں۔ اور جب اخبار کی حالت ایسی ہو جائے۔ تو اس کا جو اثر معاشرے پر ہو گا۔ اُس کی خطرناک نوعیت واضح ہے۔

ان خطرات کا سدِّ باب کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ اضلاعی اخبارات کی ترقی کے لئے ٹھوس اور ہمہ گیر تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کام میں پہلا اور بنیادی عنصر تو خود اضلاعی اخبار نویس ہیں۔ جب تک وہ خود اپنی حالت سُدھارنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو گی۔ دوسرا عنصر حکومت کا محکمۂ اطلاعات ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں ایسے محکمے صحافت کے معیار کو بہتر بنانے میں مدد نہیں دیتے۔ لیکن ایشیائی ملکوں میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً اگر انڈونیشیا کا محکمۂ اطلاعات اخبارات کی مدد سے دستکش ہو جائے۔ تو وہاں کے بہت سے اخبار ابھی بند ہو جائیں۔ ترکیہ کا محکمۂ اطلاعات اگر اخباروں کی سرپرستی نہ کرے۔ تو ترکیہ اپنی واحد قومی خبر رساں ایجنسی سے محروم ہو جائے کیونکہ یہ ایجنسی حقیقت میں ایک سرکاری محکمہ ہے۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی

بات نہیں - اسی طرح اگر ایران کا محکمۂ اطلاعات صحافت کی مدد سے الگ ہو جائے تو اس ملک کے اخبار اندرون ملک کی خبریں بلکہ بعض حالات میں غیر ملکی خبروں سے بھی محروم ہو جائیں۔ اس لئے اس امر میں کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ یہ عین مستحسن ہے کہ اضلاعی اخبارات اپنے موجودہ دور میں محکمۂ اطلاعات کی امداد قبول کرلیں۔ تیسرا عنصر بڑے قومی اور علاقائی اخبار ہیں جو اضلاعی اخباروں کی خاصی مدد کر سکتے ہیں اور چوتھا عنصر صحافیوں کی جماعتیں ہیں۔

اضلاعی اخبار نویس عموماً اپنی دو مشکلات کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک کاغذ کی کمیابی دوسرے سرکاری اشتہاروں میں اضلاعی اخباروں کے حصے کا فقدان۔ اول الذکر شکایت بڑے شہروں میں بھی ہے۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستانی نیوز پرنٹ کی پیداوار بڑھائی جائے۔ اور اس کے نرخ بین الاقوامی سطح پر لائے جائیں۔ یہ مطالبہ بھی غلط نہیں کہ مقامی اور علاقائی اہمیت کے سرکاری اشتہاروں میں اضلاعی اخباروں کا حصہ ہونا چاہیئے۔ بہر حال اخبار نویسوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف سرکاری اشتہاروں کی مدد سے آج تک کوئی اخبار نہیں چلا۔ اس میں اور بھی بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اُنھیں زیادہ تر جدوجہد مقامی تجارتی اشتہارات پر مرتکز کرنی چاہیئے۔ اور یہ اشتہار صرف اس صورت میں مل سکتے ہیں۔ کہ اُن کی اشاعت زیادہ ہو۔ اور اشاعت بڑھانے کا طریقہ یہی ہے کہ پرچے کو ہیئت اور مواد کے اعتبار سے اتنا پرکشش بنا دیا جائے۔ کہ لوگ اسے ضرور خریدیں۔ اس میں اگر قومی اور علاقائی اخباروں کی نقل کی جائے گی۔ تو اُس سے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ کیونکہ جتنا سرمایہ

ان بڑے اخباروں میں صرف ہو رہا ہے۔ اتنا کوئی ضلعی اخبار صرف نہیں کر سکتا۔ ضلعی اخبار کو بہتر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ قومی اخبار کو خریدنے کے باوجود ضلعی اخبار کو بھی ضروری سمجھیں۔

ایک ہفت روزہ ضلعی اخبار میں چار چیزیں ضروری ہیں:

۱۔ مقامی خبریں پوری تفصیل کے ساتھ۔ مقامی مسائل پر مختصر مضامین، مقامی مسائل پر مختصر اداریے اور شذرے۔

۲۔ صرف اہم اور ضروری ملکی اور غیر ملکی خبروں کی تلخیص۔

۳۔ اضافۂ معلومات اور تفریح کے لئے ہلکے پھلکے دلچسپ مضامین۔ کارٹون وغیرہ۔

۴۔ مقامی لکھنے والوں کی ادبی اور علمی کاوشیں، جن میں مقامی رنگ نمایاں ہو۔ اگر یہ چاروں عناصر ایک متوازن انداز میں موجود ہوں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی اشاعت نہ بڑھے۔ اخبار کو دیہات میں پہنچانے کی سعی بھی کرنی چاہیئے اور اس کے لئے دیہاتیوں کی دلچسپی کا مواد شامل کیا جائے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ اضلاعی اخباروں کا ایڈیٹر عام طور پر ایک ہی ہوتا ہے۔ اور لبا اوقات وہی مینجر بھی ہوتا ہے۔ دوسرے بیشتر حضرات کم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ محکمۂ اطلاعات ایک "فیچرز سنڈی کیٹ" قائم کرے جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ اضلاعی اخبارات کو دلچسپ اور عام معلوماتی مختصر سے مضمون، کارٹون، نقشے خاکے مفت مہیا کرے۔ اور اس میں کوئی پروپیگنڈہ نہ ہو۔ ان تمام فیچروں کو خوش نویسوں اور کارٹون بنانے والوں سے تیار کرا کے ان کے بلاک بنوائے جائیں اور نہایت صاف ستھرے چربے اخبارات کو بھیجے جائیں۔

تاکہ اگر اخبار ۲۰×۳۰ کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ تو دو صفحے کا مواد تو اس طرح بلامعاوضہ حاصل ہو جائے۔ اس سے کاتب اور ایڈیٹر کا بوجھ ہلکا ہو گا اور وہ باقی صفحات کی تحریر و ترتیب اور کتابت پر زیادہ محنت صرف کر سکیں گے۔ یہی فیچر ز سنڈیکیٹ اہم ملکی اور غیر ملکی خبروں کی تلخیص مہیا کرے۔ نیز تعلقاتِ عامہ یا محکمۂ اطلاعات کی فراہم شدہ خبروں میں سے علاقائی اور ضلعی دلچسپی کا مواد منتخب کر کے بھیج دے۔

مواد کی فراہمی کے باوجود ضروری ہے کہ اضلاعی اخبار نویسوں کی پیشہ ورانہ تربیت کے لئے ریفریشر کورس جاری کئے جائیں۔ مثلاً ایک کورس کی میعاد پندرہ دن کی ہو۔ جس میں اس قسم کے موضوعات پر لیکچروں کا بندوبست کیا جائے۔

اضلاعی اخبار میں کیا کچھ ہونا چاہیئے؟

اضلاعی اخبار کے میک اَپ کے اصول اور عملی پہلو۔

اضلاعی اخباروں کے لئے خاص فیچر اور مضامین لکھنے کے طریقے

صحافت کے اخلاقی اُصول

قوانینِ صحافت

اخبار کی اشاعت بڑھانے اور اِسے تجارتی لحاظ سے منافع بخش بنانے کے طریقے۔

یہی نہیں۔ ہر لیکچر حقیقت میں ایک مذاکرے کا پیش خیمہ ہو۔ جس میں سب کو شرکت اور اظہارِ رائے کا موقعہ دیا جائے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ ایسے مذاکرات سے ہمارے اضلاعی اخبار نویسوں کا دائرۂ نظر وسیع ہو گا۔ اور وہ اپنے اخبارات کا معیار بلند کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں ضروری

ہے کہ صوبائی محکمۂ اطلاعات اخبار نویسوں کا سفر خرچ اور دوسرے اخراجات برداشت کرے۔

اضلاعی اخبار نویسوں کی معلومات بڑھانے کے لئے ایک اور تجویز قابلِ غور ہے۔ کہ بڑے بڑے شہروں سے نکلنے والے اردو کے اعلیٰ روزنامے ایسی سہولتیں مہیا کریں کہ اضلاعی اخبار نویس باری باری ایک ایک مہینے کے لئے ان کے دفاتر میں کام کریں اور مختلف شعبوں کے بارے میں تھوڑی معلومات حاصل کرلیں۔ ہو سکتا ہے کہ انھیں ایسے تجربات پیش آئیں جن پر عمل کر کے وہ اپنے اخباروں کو بہتر بنالیں۔

صحافت، گیت سے "سونوراما" تک

ابھی تہذیب اپنے لڑکپن میں تھی۔ کہ "زبانی" صحافت نے جنم لیا اور اعلانچی شہروں میں پھر پھر کر کبھی گیتوں کے روپ میں اور کبھی تقریر کی صورت میں لوگوں کو تازہ خبروں سے آگاہ کرنے لگے۔ معاشرے کو نظم و ضبط ملا تو قلمی صحافت نمودار ہوئی۔ ایشیائی ملکوں میں بادشاہوں نے وقائع نگار، روز نامہ نویس اور اخبار نویس مقرر کئے۔ جو مختلف شہروں سے خبر نامے مرتب کر کے بھیجا کرتے تھے۔ یورپ میں نجی اور قلمی صحافت نے ایک اور صورت اختیار کی۔ پیشہ ور اخبار نویس اپنے شہر کی اہم خبریں مرتب کر کے ہاتھ سے نقلیں تیار کر لیتے تھے۔ اور دور دراز بسنے والے امراء کو ارسال کر کے اُن سے معاوضہ لے لیتے تھے۔ جب سائنس نے نئی کروٹ لی تو چھاپہ خانہ ایجاد ہوا۔ اور اس کے بطن سے مطبوعہ صحافت پیدا ہوئی۔ یہ بڑی سخت جان ہے۔ حاکموں نے اِسے دبانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اس نے اتنی حیرت انگیز ترقی کی کہ آج دنیا بھر کے سیاسی اور عقائدی کھیل اسی کی بدولت کھیلے جاتے ہیں۔ اور یہ اسی کی مہربانی ہے کہ دنیا بے حد

مختصر ہو گئی ہے۔

سائنس عروج پر آئی۔ تو نئے عناصر نے مطبوعہ صحافت کو للکارا ان میں سرِ فہرست ریڈیو ہے۔ آج دنیا بھر میں ریڈیو سٹیشنوں کے جال بچھے ہیں۔ جہاں سے خبریں، فیچر، ڈرامے، تقریریں، غرض سب کچھ نشر ہوتا ہے۔ ریڈیو کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی آواز ملکی حدود کے اندر مقید نہیں کی جا سکتی اور ہر قسم کے خیال کی تبلیغ دنیا کے ہر مقام پر ہو سکتی ہے آج دنیا سیاسی عقیدے کی بنا، پر دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک طرف اشتراکی اور اشتمالی دنیا ہے۔ اور دوسری طرف جمہوری دنیا اور دونوں کے عقائد کی تبلیغ ریڈیو کے ذریعہ سے آزادانہ ہوتی ہے۔ گویا دونوں کو آزادی ہے کہ رائے عامہ کو اپنے سانچے میں ڈھال لیں۔ ریڈیو کی آواز کو "جام" کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ لیکن یہ اتنی کامیاب نہیں ہوتی۔ ریڈیو میں بڑا نقص یہ ہے کہ اس پر صرف آواز نشر ہوتی ہے لیکن جو شخص بولتا ہے وہ نظر نہیں آتا۔ اور شنیدہ کئے بود مانندِ دیدہ۔ چنانچہ سائنس نے یہ کمی پوری کی اور ٹیلی ویژن ایجاد ہوا۔ اب جہاں ٹیلی ویژن موجود ہے۔ وہاں ہر شخص سامعین میں بھی شامل ہے اور تماشائیوں میں بھی اور ڈرائینگ روم میں بیٹھے بیٹھے دور دراز کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

ٹیلی ویژن میں بڑی خامی یہ ہے کہ اتنی ترقی کے باوجود ابھی تک اس کا پروگرام تین سو میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں نشر کیا جا سکتا۔ اور اگر راستے میں زیادہ اونچے پہاڑ آ جائیں تو پھر فاصلہ اور بھی کم رہ جاتا ہے اس سلسلے میں انگلستان اور جاپان کو تو کوئی خاص دِقّت نہیں تھی۔

کیونکہ ان کے رقبے کم ہیں اس لئے فاصلے بھی تھوڑے ہیں۔ لیکن امریکہ اور سوویٹ یونین کے رقبے بہت وسیع ہیں۔ اس کا علاج یوں کیا گیا ہے کہ جا بجا "ریلے" RELAY سٹیشن قائم ہیں۔ ہر تین تین سو میل کے فاصلے پر ایسے ٹیلی ویژن سٹیشن قائم ہیں۔ جو سارا پروگرام اسی طرح بیک وقت نشر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں کراچی، لاہور، راولپنڈی پشاور، کوئٹہ، حیدر آباد، ڈھاکہ، راج شاہی اور چاٹگام سے بیک وقت خبریں نشر ہوتی ہیں۔ سوویٹ یونین میں ٹیلی ویژن نے ابھی زیادہ ترقی نہیں کی۔ لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تو اس کی رفتارِ ترقی اتنی تیز ہے۔ کہ وہاں ریڈیو سیٹوں سے کہیں زیادہ تعداد میں ٹیلی ویژن سیٹ موجود ہیں۔ یورپی ممالک میں ٹیلی ویژن نے زیادہ ترقی نہیں کی۔ لیکن، "بین الاقوامی ٹیلی ویژن" میں اُن کی ترقی کا ایک پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یورپ میں ایک ٹیلی ویژن پروگرام "یورو ویژن" -EURO VISION کے نام سے مشہور ہے۔ جس کی ترتیب مغربی یورپ کے تمام ممالک مِل کر کرتے ہیں۔ نومبر ۵۸ء میں جب ویٹی کن سے پوپ کی رسمِ تاج پوشی نشر ہوئی۔ تو راقم الحروف نے یہ سارا پروگرام سٹراس بورگ میں دیکھا۔ جو جرمنی کی سرحد کے قریب فرانس کا ایک مشہور شہر ہے ہر روز رات کو "یورو ویژن" کا مرتبہ ایک رنگا رنگ پروگرام "ریلے نظام" کی مدد سے نشر ہوتا تھا۔ جس میں مغربی یورپ کے مختلف واقعات ہم لوگ گھر بیٹھے دیکھ لیتے تھے۔

مصنوعی سیاروں کی ایجاد نے ٹیلی ویژن میں ایک انقلاب کی تخلیق کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ امریکی سیارہ "ٹل سٹار" TELSTAR

خلامیں رہ کر ایک ایسے سٹیشن کا کام دیتا ہے۔ جس کی مدد سے ایک ہی پروگرام کم از کم نصف دنیا میں ایک ہی وقت پر نشر ہو سکتا ہے۔ اس پر آزمائشی پروگرام ہوئے ہیں۔ ابھی کچھ اڑچنیں باقی ہیں۔ لیکن ان پر جلد قابو پالیا جائے گا۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی مقبولیت کے باوجود مطبوعہ صحافت ابھی تک پھل پھول رہی ہے۔ بعض ملکوں میں اِسے کچھ نقصان پہنچا ہے۔ کہ بعض صنعت کار اپنی مصنوعات کا اشتہار دینے میں ٹیلی ویژن کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس سے اخباروں کی اشتہاری آمدنی میں کمی ہوئی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اخبار ابھی تک ہر دلعزیز ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ مطبوعہ صحافت بہت سخت جان ہے۔ ریڈیو نے یورش کی۔ ٹیلی ویژن نے حملہ کیا لیکن مطبوعہ صحافت نے سب کا مقابلہ کامیابی سے کیا۔ آج کل مطبوعہ صحافت میں بھی بعض دلچسپ جدتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ مثلاً جاپان سے ایک رسالہ جاری ہے۔ جس سے خوشبو آتی ہے اور یہ چھ مہینے تک معطر رہتا ہے۔ یہ کوئی خاص بات نہیں میں نے پیرس میں سالگرہ پر بھیجے جانے والے ایسے معطر کارڈ دیکھے ہیں جن کی خوشبو ایک سال سے زیادہ عرصہ رہتی ہے۔ تقسیم سے چند سال پہلے کا ذکر ہے۔ لاہور کے بعض اردو اخبار معطر ہوتے تھے۔ اور صفحۂ اول پر لکھا ہوتا تھا کہ اس اخبار کی پشت معطر ہے۔ اور مولانا چراغ حسن حسرت نے اس پر دلفریب نکتہ آفرینیاں بھی کی تھیں۔ لاہور کے جرائد اس لئے معطر نہیں ہوتے تھے کہ اس سے کوئی جدت مقصود تھی۔ اُن دنوں "رشکِ مُنیر" کے نام سے ایک نیا عطر تیار ہوا تھا۔ اور جو کمپنی اُسے بناتی تھی۔ اُس نے عطر کو مقبول کرنے کے لئے یہ جدّت اختیار کی۔ کہ ہر اخبار کے آخر میں نصف صفحے کا اشتہار

دینا شروع کیا۔ اور اشتہار والے حصّے کو معطّر کر دیا۔ یہ سٹنٹ بہت کامیاب رہا۔ اور کچھ عرصہ تک "رشکِ منیر" خوب چلتا رہا۔

۱۹۵۸ء میں یورپ میں ایک نئی قسم کا مجلّہ سونوراما SONORAMA کا بہت چرچا ہوا۔ یہ ایک باتصویر اور بولتا گاتا رسالہ تھا۔ اکتوبر ۵۸ء میں جاری ہوا۔ نومبر میں میں فرانس ہی میں تھا۔ تو میں نے اس کا دوسرا شمارا خریدا جواب بھی میرے پاس موجود ہے۔ یہ پیرس سے نکلتا تھا۔ تقطیع "لیل ونہار" کی دو تہائی کے برابر تھی۔ اعلیٰ درجے کے آرٹ پیپر کے چوبیس صفحات پر مشتمل تھا۔ ہر پرچے میں چھ موضوعات پر مواد دیا جاتا تھا۔ ان میں ملکی اور غیر ملکی سیاست، تھیٹر، موسیقی اور دوسرے ثقافتی موضوعات بھی شامل تھے مقصود یہ تھا کہ ایک مہینے کے چھ بڑے واقعات اس طرح ڈرامائی انداز میں پیش کئے جائیں کہ پڑھنے والے کو ایک تو ان سے تعلق رکھنے والی تصویریں ملیں۔ دوسرے مختصر سا تحریری مواد حاصل ہو۔ تیسرے پڑھنے والا ان واقعات کا "سامع" بھی بنے۔ سماعت کے لئے ان چھ واقعات سے تعلق رکھنے والے جو گراموفون ریکارڈ منسلک ہیں یہ عام ریکارڈوں سے مختلف ہیں یہ سفید پلاسٹک کی نہایت پتلی چادر سے بنائے جاتے ہیں اور آرٹ پیپر کی طرح معلوم ہوتے ہیں اور باقی صفحات کے ساتھ منسلک ہیں۔ ہر ریکارڈ پر ۳۳⅓ چکر ہیں، اور ریکارڈ تقریباً چھ منٹ چلتا ہے رسالہ کے عین وسط میں ایک سوراخ ہے جب کوئی ریکارڈ سننا ہو۔ اس کا صفحہ الٹ کر رسالہ گراموفون یا ریکارڈ پلیئر RECORD PLAYER پر رکھ دیا جاتا ہے جونہی گراموفون چلتا ہے آواز آنی شروع ہو جاتی ہے۔ تحریری متن تصاویر اور آواز کے اس مشترکہ مظہر رسالے کو SONORANA اس لئے کہا جاتا ہے کہ فرانسیسی زبان میں SONORE آواز کو کہتے ہیں اس لفظ کا آخری حرف "E" حذف کر کے MAGAZINE کے پہلے دو حرف

MA اس کے ساتھ لگا دیئے۔ تو مشترکہ لفظ SONORAMA بن جاتا ہے۔ یعنی "بولتا مجلّہ" یہ رسالہ بہت جلد مقبول ہو گیا۔ دوسرے شمارے کی اشاعت ساٹھ ہزار تھی۔ نیز اخبارات میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ یہاں تک کہ "نیویارک ہیرلڈ ٹریبون" کے پیرس ایڈیشن میں اس کا ذکر بڑی بڑی سُرخیوں سے کیا گیا۔

سٹراس بورگ یونیورسٹی میں منعقدہ ایک اعلیٰ بین الاقوامی صحافتی کورس میں (جس میں میں شریک تھا) جہاں اور موضوع زیر بحث آئے۔ وہاں 'سونوراما' کا ذکر بھی ہوا۔ یونیسکو کے شعبۂ ابلاغِ اجتماعی کے ڈپٹی ڈائرکٹر مسٹر ہنری فاسٹ نے ٹیلی ویژن کے مستقبل پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے کہا کہ کم ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم کم ہے۔ اس لئے وہاں عوام کو حالات سے باخبر رکھنے کے لئے ٹیلی ویژن مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اور آنے والے زمانے میں ان ملکوں میں ٹیلی ویژن کو بہت عروج ہو گا۔ میں نے اُن سے اختلافِ رائے کیا۔ کیونکہ ٹیلی ویژن میں بعض بنیادی مشکلات ایسی ہیں۔ جو کم ترقی یافتہ ممالک میں اُس کی ترقی کے راستے میں حائل ہوں گی۔ ایک مشکل تو وہی ہے جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ کہ ٹیلی ویژن کا دائرہ تین سو میل سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور اکثر کم ترقی یافتہ ممالک کے رقبے اتنے وسیع ہیں کہ ہر ملک میں ٹیلی ویژن کو عوام تک پہنچانے کے لئے ریلے سٹیشنوں کا ایک وسیع جال بچھانا پڑے گا۔ دوسرے ٹیلی ویژن پر اتنا زیادہ خرچ آتا ہے۔ کہ ہم لوگ محدود پیمانے پر تعلیمی مقاصد کے لئے بعض شہروں میں ٹیلی ویژن کا سلسلہ شروع کر سکتے ہیں۔ لیکن اس بات کا تصوّر نہیں کر سکتے کہ مستقبلِ قریب میں ٹیلی ویژن کا ایک ایسا نظام قائم کریں جو سارے ملک پر حاوی ہو۔ اور عمومی پروگرام پیش کرے۔ تیسرے

ٹیلی ویژن کا سٹیشن چالو رکھنے اور پروگرام پیش کرنے کے اخراجات ریڈیو کے مقابلے پر کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر ٹیلی ویژن کے لئے بجلی کی ضرورت ہوتی ہے اور کم ترقی یافتہ ممالک میں وسیع رقبے بجلی سے محروم ہیں۔ اور ان سب مشکلات پر قابو پا بھی لیا جائے۔ تو یہ سوال باقی رہتا ہے کہ جن ممالک میں معیارِ زندگی اتنا پست ہے کہ ریڈیو سیٹوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ وہاں کتنے لوگ ٹیلی ویژن کے مہنگے سیٹ خرید سکتے ہیں۔ میں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ کم ترقی یافتہ ممالک میں پہلے مرحلے پر ریڈیو ہی کو زیادہ ترقی دینی چاہیئے۔ دوسرے اصلاحِ دیہات، تعمیرِ ملی اور دوسرے مقاصد کے لئے "سونوراما" جیسے مجلّوں کو رواج دینا چاہیئے۔ جن کی لاگت کم ہے اور افادی اہمیت زیادہ. ہمارے ہاں بعض تعمیری مقاصد کے لئے جو سرکاری جرائد جاری ہیں۔ اگر ان میں سے بعض کو "سونوراما" کے قالب میں ڈھالا جائے تو اس سے بہت اچھے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

اشاریہ

انجمن ترقی اُردو

کی مطبوعات

اسٹوڈنٹس انگریزی اُردو ڈکشنری :- یہ ڈکشنری اسٹینڈرڈ
بابائے اردو
ڈکشنری کا خلاصہ ہے، اس میں سے وہ الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں جو مخصوص علوم وفنون سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے عام لوگوں کو واسطہ نہیں پڑتا۔

قیمت عام ایڈیشن کرنافلی سفید کاغذ ۱۵ روپے

قیمت خاص ایڈیشن بائیبل پیپر :- ۲۱ روپے

پاپولر انگریزی اُردو ڈکشنری :- کالج اور مدارس کے عام
بابائے اردو
طالب علموں نیز عام پڑھنے والوں کے لئے خاص طور پر یہ ڈکشنری تیار کی گئی ہے جو مذکورہ دونوں ڈکشنریوں سے مختصر بھی ہے اور کم قیمت بھی۔

قیمت :- چھ روپے پچاس پیسے

داستان زبان اُردو :- ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو
ڈاکٹر شوکت سبزواری
کے لسانی مسائل پر کئی گراں قدر مقالے اور کتابیں لکھ چکے ہیں "داستان زبان اُردو" ان کا تازہ ترین علمی کارنامہ ہے جس میں انہوں نے اُردو زبان کے لسانی سرمائے، مختلف نظریوں

مولد و منشاء صرفی نحوی نشو و نما، مزاج و منہاج اور ارتقاء کے مدارج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اردو زبان کے بارے میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے

قیمت : پانچ روپے

کیفیہ : اُردو زبان کی مختصر تاریخ اور اس کی انشاء، املا، نحوی مسائل وغیرہ کے متعلق پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی ہر قسم کے ضروری اور اہم امور سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب علامہ کیفی کی زندگی بھر کی علمی تگ و دو کا حاصل ہے۔ اس میں انہوں نے زبان اردو کو پیش آنے والے بہت سے مسائل کا حل تجویز کیا ہے نیز ان مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو ہماری زبان کی ترقی میں حارج ہیں۔

قیمت پانچ روپے

سید احمد خاں ۔ حالات و افکار : ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی نشاۃ ثانیہ کے اولین معمار بابائے اردو

سید احمد خاںؒ کی شخصیت اور علمی کارناموں کا جائزہ جس میں بابائے اردو نے سرسید کے حالات اور افکار کے بعض پہلوؤں پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کو مولانا حالی کی "حیات جاوید" کا ضمیمہ سمجھنا چاہیئے۔

قیمت چار روپے

غالب فکر و فن : مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت ڈاکٹر شوکت سبزواری سبزواری درجہ استنا د رکھتے ہیں۔ انہوں نے غالب کی شخصیت، اس کے ماحول اور فن کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو مقالات لکھے ہیں انہیں اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔

قیمت پانچ روپے

تلخیص الاردو:۔ یہ انجمن کے مشہور علمی جریدے سہ ماہی "اردو" کے سالہا سال کے پرچوں کے بہترین مضامین کا انتخاب ہے۔ اس میں مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے گیارہ علمی و ادبی مقالات شامل ہیں۔

قیمت پانچ روپے پچاس پیسے

اُردو تھیٹر:۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ڈاکٹر عبدالعلیم نامی (پرنسپل اورینٹل کالج بمبئی) نے اردو ڈرامے کی مکمل تاریخ مرتب کی ہے جس میں ڈراموں ڈرامہ نگاروں، اداکاروں اور ڈرامہ کمپنیوں وغیرہ کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ یہ کتاب دراصل اُردو ڈرامے کا "ان سائیکلو پیڈیا" ہے تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

قیمت فی جلد سات روپے

سعادت یار خاں رنگین:۔ ڈاکٹر صابر علی خاں یہ کتاب سعادت یار خاں رنگین کے حالات زندگی اور جائزہ تصانیف پر مشتمل ہے فاضل مصنف کو اس تحقیقی کارنامے پر پنجاب یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطاء کی تھی۔

قیمت پانچ روپے پچھتر پیسے

محمد حسین آزاد:۔ ڈاکٹر اسلم فرخی یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر مصنف کو کراچی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کی ہے فاضل مصنف نے اس میں مولانا آزاد کے حالات زندگی اور ان کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔